سیّد احمد شہیدؒ

کی

صحیح تصویر

وحید احمد مسعود

صرف سرورق جاپان آرٹ پریس لاہور میں چھپا

سید احمد شہید

کی

صحیح تصویر

از

وحید احمد مسعود

مکتبہ مسعود تیزاب احاطہ روڈ لاہور

مکتبہ مسعود، تیزاب احاطہ روڈ۔ لاہور

فہرست

پیش گفتار

جناب سید احمد شہید اور اُن کی "تحریکِ جہاد" کے بارے میں اب تک جو کچھ لکھا گیا ہے، وہ اُن کے عقیدت مندوں اور اُن کی "تحریکِ جہاد" کے رُوحِ رواں جناب شاہ محمد اسمٰعیل صاحب کے مقلدوں کے اذہان کی پیداوار ہے اور ہر تذکرہ نگار نے اپنا نیا راگ الاپا ہے۔ کسی نے بھی عقیدت کی عینک اُتار کر اصلیت تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی، بلکہ سارا زورِ قلم سید صاحب کو مامور من اللہ، معصوم عن الخطا، مجدد وقت، امام زمان اور تحریک آزادی کا ہیرو ثابت کرنے میں صرف کر دیا ہے مگر پھر بھی نتیجہ لا حاصل، اور ہر ذی شعور انسان ان ضخیم و جسیم تذکروں کو بہ نظرِ غائر پڑھ لینے کے بعد اسی نتیجے پر پہنچتا ہے کہ اس تحریک کے مایۂ ناز مورخوں سے بات نہیں بنی۔ اور ان سے وہ بات بھی چھپائی نہیں جا سکی، جس کو چھپانے کے لئے انہوں نے اس قدر مغز ماری کی ہے اور بیچارے محمد جعفر تھانیسری کو تحریف کا مرتکب "ثابت" کر کے اس کے کفن کو داغدار کیا ہے۔۔۔۔ ہاں یہ تذکرے عقیدتمندوں اور اندھے مقلدوں کے قلوب کو بہلا سکتے ہیں، گو ان کے دماغوں کو اپیل نہ کریں، مگر دل کا بہل جانا بھی تو بڑی بات ہے۔

ایسے تذکروں کو لکھ اور پڑھ کر اگر ایک خاص گروہ کے دل بہل جاتے ہیں تو یہ اپنی جگہ ٹھیک۔ مگر تاریخ کو مسخ کرنے اور زید کی پگڑی بکر کے سر رکھنے

کی اجازت دے دینا بہت بڑا ظلم ہے۔ چنانچہ تاریخ کو مسخ ہونے
سے بچانے کی خاطر جناب مولانا وحید احمد مسعود مصنّف کتب کثیرہ نے
ان موقع شناس قلم کاروں کے خلاف اپنے قلم حقائق رقم کو حرکت میں لاکر
ان کی مصلحت آمیز تحقیقات کے تار و پود کو بکھیر کر رکھ دیا ہے اور جناب
سید احمد شہیدؒ کی صحیح صحیح تصویر کھینچ کر عوام کے سامنے پیش کر دی ہے
محترم مولانا وحید احمد مسعود صاحب یہ عظیم کارنامہ سر انجام دے کر اپنے فرض
سے سبکدوش ہونے کے علاوہ اہل علم کے شکریہ کے مستحق ہو گئے ہیں جزاہ اللہ تعالیٰ

پیش نظر کتاب "سید احمد شہید کی صحیح تصویر" جناب مولانا مسعود صاحب
نے ماہنامہ "منادی" دہلی بابت ستمبر ۱۹۶۶ء میں خاص نمبر کی صورت میں شائع
کروائی تھی اور مدیر "منادی" نے اپنے ادارتی نوٹ[1] میں بڑی فراخدلی سے
دعوت دی تھی کہ اگر کوئی صاحب اس کا جواب لکھنا چاہیں تو "منادی" کے
صفحات اس کے لئے حاضر ہیں مگر آج تک مدیر صاحب کی دعوت کو کسی
نے شرف قبول نہیں بخشا۔ اور اب تک یہ کتاب لاجواب پڑی ہے۔ اس کا
جواب لکھنا جن حضرات کے ذمے تھا، ظاہر ہے کہ ان سے ان کے مریدین
نے وجہ خاموشی ضرور دریافت کی ہوگی مگر منطقیانہ جواب دے کر ٹال دیا ہوگا
لیکن جواب نہ دینے کی اصل وجہ یہ ہے کہ انہوں نے عافیت اسی میں
سمجھی کہ جواب نہ دے کر جواب الجواب کی زد سے بچا جائے اور بذریعہ
خاموشی اس اٹھ کھڑے ہوئے مسئلے کو ختم کر دیا جائے ورنہ بنا بنایا کھیل
خراب ہو جائے گا ـــــ مگر یہ خیال خام ہے!

---

[1] یہ نوٹ افتتاح سخن کے زیر عنوان ص ۸ پر درج ہے۔

جملہ تذکرہ نویسیوں کے بقول جناب سیّد صاحب متنوع خوبیوں کے مالک بزرگ تھے لیکن اُن کی بنیادی اور سب سے اہم خوبی اُن کی بے پناہ روحانیت اور کمالِ ولایت ہے اور ان ہی کمالاتِ عالیہ کی بدولت انہوں نے تسخیر خلائق کی تھی اور روحانیت کے زور سے لوگوں کو آمادۂ جہاد کیا تھا اور سلاسلِ فقر میں ایک نئے سلسلے "طریقۂ محمدی" کا اضافہ کیا تھا ۔ لہٰذا سید صاحب کی ذات کو پہچاننے کیلئے سب سے اوّل اُن کی اس مبینہ حیثیّت کی حقیقت کو سمجھنا از حد ضروری ہے چنانچہ پیشِ نظر کتاب میں سیّد صاحب کی اسی حیثیت کو زیرِ بحث لایا گیا ہے اور حاصل بحث یہ ہے کہ جناب کی یہ حیثیّت بھی مشتبہ ہے اور جب ہم اس پر غور کرتے ہیں کہ آج محمدی سلسلہ معدوم ہے اور اس وقت اس "عظیم" سلسلے کا کوئی شیخ نظر نہیں آتا اور اسی معدومیّت کی بنا پر خود معتقدین سید صاحب میں سے دیوبندی گروپ کے لوگ دوسرے سلسلوں میں بیعت ہوتے ہیں تو یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ یہ فیضانِ ولایتِ محمدی نہیں تھا بلکہ جناب شاہ صاحب کے علم و فضل کی کرشمہ سازیاں تھیں، غرض کہ جناب مصنّف نے سید صاحب کی روحانی کیفیات کا نقشہ اس خوبی سے کھینچا ہے کہ اس کی داد نہیں دی جا سکتی۔

مسائل تصوّف عوام تو کجا بعض سے مولویوں کے فہم سے بھی بالا ہوتے ہیں لہٰذا اس بحث کو پڑھ کر وہی لوگ پورے طور پر محظوظ ہو سکتے ہیں جنہوں نے تصوّف کی حقیقت کو سمجھا ہے لیکن عوام کی دلچسپی کے سوالات یہ ہیں :-

- سید صاحب کے جہاد کا رُخ انگریزوں کی جانب تھا یا سکھوں کی طرف ؟
- سید صاحب نے تحریک جہاد کا آغاز انگریزوں کے اشارے پر کیا تھا یا حکم الٰہی سے ؟

• سید صاحب نے انگریزی علاقے میں کھلے بندوں جہاد کی تیاری کی اور چندہ جمع کیا مگر انگریز اڑے کیوں نہیں آئے؟ • سید صاحب اگر انگریزوں کے مخالف تھے تو انہیں انگریزی عملداری سے سرحد میں مدد کیوں پہنچتی رہی؟ • سید صاحب کو انگریزی عملداری سے باہر ہر مقام پر انگریزوں کا جاسوس کیوں سمجھا گیا؟ • سید صاحب کی دعوتیں انگریزوں نے کیوں کیں؟ • سید صاحب نے غیر ملکی انگریزوں کو نکالنے کے لئے سکھوں سے کوئی بات چیت کی تھی؟ • سید صاحب نے سکھوں کے علاوہ سرحدی و قبائلی پٹھانوں کا جو خون بہایا، کہاں تک جائز تھا؟ • سید صاحب مجدد تھے تو انہوں نے حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کی طرح مسلمانوں کی اصلاح کر کے انہیں متحد و متفق کیا یا بیسیوں اختلافی مسائل پیدا کر کے باہمی سر پھٹول میں مبتلا کر دیا؟ • سید صاحب کے حکم سے بیوگان کے زبردستی نکاح کر دینے میں کونسی دانشمندی تھی؟

ان سب سوالوں کے جواب اس کتاب میں موجود ہیں مگر تفصیل کے بجائے اشاروں کنایوں سے جواب دیئے گئے ہیں جو حقیقت کے متلاشی کو مطمئن کرنے کیلئے کافی ہیں۔ ہٹ دھرمی، ضد اور تعصب بے جا کا علاج کسی کے پاس نہیں ہے۔

"سید احمد شہید کی صحیح تصویر" کی اشاعت یہاں بےحد ضروری تھی کیونکہ پاکستان ہی میں سب سے زیادہ اس تحریک کو غلط رنگ میں پیش کیا گیا ہے۔ کارکنانِ مکتبہ مسعود لاہور مستحقِ صد ستائش و مبارکباد ہیں کہ انہوں نے اس ضرورت کو پورا کر دیا ہے۔ اس کتاب کی اشاعت سے تصویر کا صحیح رُخ عوام کے سامنے آ جائیگا۔ محققین کے لئے غور و فکر کی نئی راہیں کھل جائیں گی اور یہاں عقیدت مند مصنفین جانبدارانہ تحقیقات کو چھوڑ حقیقت کو تلاش کرنے کی سعی فرمائیں گے۔

محمد سعید نعمانی

۲۴ جولائی ۱۹۶۶ء
لاہور

اِفتتاحِ سخن

اس حقیقت سے کوئی انصاف پسند آدمی انکار نہیں کر سکتا کہ برِصغیر کے صوفی بزرگ حضرت مولانا حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی ؒ کے عقائد ان عقائد سے مختلف تھے جو آج ان کے مبینہ پیروکاروں کا طرۂ امتیاز ہیں اور جن کی وجہ سے چشتی صابری نسبت کے باوجود دیوبندی اسکول کو تصوّف اور چشتیت کے لئے ایک تہمت سمجھا جانے لگا ہے پیر و مرشد کے عقائد اور طریقۂ کار سے ایسا اختلاف حیرت انگیز بھی ہے اور تصوّف کی تاریخ میں اس کی اور کوئی مثال بھی نہیں ملتی تاہم عام لوگ اب تک اس اختلاف کی وجوہات سے ناواقف تھے اور انہیں اس تاریخی پس منظر کی بھی خبر نہ تھی جس میں یہ اختلاف رُونما ہُوا لیکن حال میں حضرت مولانا وحید احمد صاحب فریدی قطبی کا ایک بصیرت افروز مقالہ حضرت حاجی صاحب کے بارے میں ایسا شائع ہُوا جس نے ہر چیز کی وضاحت کر دی اور عقائد اور طریقہ کار کا یہ اختلاف عام لوگوں کے لئے بھی کم از کم حیرت انگیز نہیں رہا۔

ناظرین کو مولانا فریدی کا یہ مقالہ یاد ہو گا کیونکہ اسے مناوی میں بھی شائع کیا گیا تھا اور اس کے بعد مشہور صحافی مولانا غلام رسُول مہر کے

جواب اور مولانا فریدی کے جواب الجواب کے طویل سلسلے کو بھی ناظرین نے فراموش نہ کیا ہوگا جس کا منادی میں باقاعدگی سے اندراج ہوتا رہا اور جس سے عوام و خواص سب نے بے انتہا دلچسپی لی۔ اس دلچسپ بحث میں سب سے زیادہ گفتگو حضرت سید احمد شہیدؒ کے بارے میں رہی کیونکہ ان کے متعلق مولانا فریدی کے بعض ریمارک مولانا مہر کو شاق گزرے تھے اور انہوں نے بڑی شد و مد کے ساتھ مولانا فریدی کو اس کا جواب دیا تھا۔ منادی اس ساری بحث کو غیر جانبداری کے ساتھ چھاپتا رہا اور موافقت مخالفت میں کوئی رائے نہیں دی اور...... نتائج اخذ کرنے کے لئے ناظرین کے ذہن کو آزاد چھوڑ دیا۔

حضرت مولانا وحید احمد صاحب فریدی کا زیر نظر جامع مقالہ بھی (جس پر منادی کا یہ خاص نمبر مشتمل ہے) اسی بحث کا ایک حصہ ہے اور سابق کی طرح اب بھی منادی غیر جانبداری کو قائم رکھتے ہوئے اور کوئی رائے دیئے بغیر اسے بے کم و کاست ناظرین کی خدمت میں پیش کر رہا ہے۔

اب تک منادی میں مولانا مہر کے جوابات بھی چھپتے رہے تھے لیکن ہمیں افسوس ہے کہ مولانا فریدی کا یہ مقالہ ہندوستان پاکستان کی موجودہ جنگ کے باعث مولانا مہر کی نظر سے جلدی نہ گزر سکے گا تاہم مولانا مہر کے ہم خیال ہندوستان اور ان غیر ممالک میں بھی کم نہیں ہیں جہاں منادی جنگ کے دوران میں بھی بھیجا جاسکے گا۔ اس لئے ان میں سے اگر کوئی صاحب مولانا فریدی کی رائے سے اختلاف کرنا چاہیں تو ان کے لئے منادی

کے صفحات حاضر رہیں گے اور امن ہونے کے بعد مولانا مہر بھی اگر اس کا جواب لکھنا چاہیں گے تو اس کو بھی شکریہ کے ساتھ شائع کیا جائیگا تاکہ پڑھنے والوں کے سامنے تصویر کے دونوں رُخ رہیں اور وہ کسی صحیح فیصلے پر پہنچ سکیں۔

یہ ایک علمی اور تاریخی بحث ہے اس سے کسی کو بُرا نہیں ماننا چاہیئے سنجیدگی سے غور کیا گیا اور لوگ تعصب میں مبتلا نہ ہوئے تو انشاء اللہ اس سے افہام وتفہیم کی راہ نکلے گی اور اختلافات کی خلیج پاٹنے میں مدد ملے گی کیونکہ اب تو حالت یہ ہے کہ تقویۃ الایمان اور صراط مستقیم نامی کتابوں کا ذکر کرتے ہی خانقاہی حلقے وہابیّت کے خطرے سے چونک پڑتے ہیں اور ان کے سامنے وہ روایت آجاتی ہے کہ شاہ اسمٰعیل جب سکھوں سے لڑنے جانے لگے تو دلّی میں انہوں نے درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کی بابت کہا کہ "سکھوں کی مہم سے فارغ ہو جاؤں تو اس بُت خانے کو بھی ڈھاؤں گا۔" اسی طرح سیّد احمد شہید اور شاہ اسمٰعیل وغیرہ سے ذہنی طور پر والبستہ طبقہ اور دیوبندی اسکول خانقاہ اور درگاہ کا نام آتے ہی بدعت اور شرک کے ڈراونے خواب دیکھنے لگتا ہے اور ذرا نہیں سوچتا کہ جس چیز کو وہ بدعت اور شرک سمجھ رہا ہے، وہ درحقیقت بدعت اور شرک ہے بھی یا نہیں اور اس کے ذہن میں اس واہمے نے کس طرح اور کیوں جگہ پائی ہے۔ اس سلسلے میں یہ دلچسپ بات بیان کرنے کے قابل ہے کہ مولانا قاری طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند نے مجھ سے تو

بیان فرمایا کہ میں اجمیر شریف گیا تو ڈر رہا تھا کہ ابھی کوئی خادم آئے گا اور زبردستی میری گردن پکڑ کر مزار کے سامنے سجدہ کرنے کے لئے مجبور کرے گا لیکن جب میں وہاں پہنچا تو گردن پکڑنا تو الگ رہا کسی نے زبان سے یا اشارے کنائے تک میں مجھ سے سجدے یا آستاں بوسی کے لئے نہیں کہا اور سب لوگ بڑے اخلاق سے پیش آئے اور میں نے اپنے عقیدے کے مطابق حاضری دی۔

ناظرین منادی حضرت مولانا وحید احمد صاحب سے بخوبی واقف ہیں ان کو حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکرؒ کی اولاد امجاد میں سے ہونے کا فخر حاصل ہے اور وہ مشرقی و مغربی قدیم اور جدید دونوں قسم کی تعلیمات سے بہرہ ور ہیں۔ ایک عرصے تک انگلستان میں رہے تحریک خلافت میں نمایاں حصہ لیا۔ حکومت یو۔ پی کے پارلیمنٹری سیکرٹری کی حیثیت سے بیش بہا خدمات انجام دیں، گوشہ نشینی ترک و تجرید اور مجاہدات سے بھی آشنا رہے غرض یہ کہ وہ ہمہ صفت موصوف بزرگ ہیں۔ اور ایک دنیا ان کی دیکھی ہوئی ہے۔ ان کے سوچنے اور نتیجہ اخذ کرنے کا انداز تقلید سے آزاد ہے۔ ان کے نزدیک تاریخ ایک پس منظر کی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ تاریخ کو بس گواہ اور شاہد سمجھتے ہیں اور اس کے طے شدہ اور ریڈی میڈ فیصلے نہیں مانگتے اور جو تاریخ اس قسم کے فیصلے دیتی ہے اس کو ایجاد بندہ سمجھتے ہیں۔ وہ دروغ کو راوی کی گردن پر رکھ کر بےفکر

نہیں ہو جاتے۔ بلکہ راوی کی گردن کو اس کے بوجھ سے ہلکا کرنا چاہتے ہیں اور آخری فیصلے اور حکم کا حق راوی کے بجائے اپنے لئے محفوظ رکھتے ہیں اور فیصلہ دیتے وقت کسی قسم کی رو رعایت پسند نہیں کرتے۔ ان کا فیصلہ تذبذب سے پاک اور دو ٹوک ہوتا ہے۔ اکثر اوقات اس سے سنگدلی ٹپکتی ہے اور قائم شدہ عقیدوں اور تصورات کو ٹھیس پہنچتی ہے۔ عدل و انصاف میں فریدی صاحب رحم دلی کو جائز نہیں سمجھتے۔ شاید اس لئے کہ یہاں رحم دلی کرپشن کا روپ دھار لیتی ہے۔

زیر نظر مقالے میں مولانا فریدی نے حضرت سید احمد شہید کی ایک نئی تصویر پیش کی ہے لیکن یہ تصویر کسی قدر دھندلی ہے۔ اس کے نقوش واضح نہیں ہیں۔ مولانا کا زیادہ وقت اُن تصویروں کو ضائع کرنے میں صرف ہوا ہے جو دوسروں کی بنائی ہوئی ہیں اور جن کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ اصلیت سے کوئی واسطہ نہیں رکھتیں اور لوگوں کے تصورات کی پیداوار ہیں۔ ان تصویروں سے محروم ہونے پر لوگ کڑھیں گے کیونکہ یہ تصویریں بہت خوبصورت اور بڑی دلکش تھیں۔ ان کے بدلے میں فریدی صاحب کی بنائی ہوئی جو تصویر لوگوں کو ملے گی وہ بری نہ سہی لیکن اتنی حسین بھی نہیں ہے۔ لیکن حقیقت پسند آدمی کے لئے اس کے سوا چارہ کار بھی کیا ہو سکتا ہے؟

اگر مولانا فریدی کی رائے مان لی جائے اور ان کے فیصلے کو

صحیح اور قطعی اور آخری فیصلہ سمجھا جائے تو ہندوستان کی تمام "دہشت وہابی" تحریکوں کا سرچشمہ ایک ایسی تحریک قرار پائے گی جس کو ایک غیر مسلم اور غیر ملکی اقتدار یعنی انگریزوں کی شہ پر شروع کیا گیا تھا اور جس کو بعد کے آنے والے بے سمجھے بوجھے باپ دادا کا قابل احترام ورثہ سمجھتے رہے اور جس کی خاطر اپنے اصل راستے سے بھٹک جانے میں بھی انہوں نے کوئی قباحت محسوس نہ کی۔

اُمید ہے مولانا فریدی کے اس بصیرت افروز مقالے سے کما حقہٗ فائدہ اٹھایا جائے گا۔

حسن ثانی نظامی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فاتحہ

حمد بے حد ہے خدائے پاک کی ‏ ‏ ‏ ‏ مصطفیٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام

اللہ تبارک و تعالےٰ کا شکر ہے۔ ایسا شکر جس کی نہایت نہیں رسُول علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی مہربانی ہے۔ ایسی مہربانی جس سے اخلاقِ الٰہی حاصل ہوتے ہیں اور بزرگانِ دین رحمۃ اللہ علیہم اجمعین کی توجّہ ہے۔ جو ہر وقت ہدایت کرتی رہتی ہے کہ یہ رسالہ تکمیل کو پہنچ سکا ہیں اپنے احباب و معاونین کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں، مگر اسمائے گرامی ظاہر کرنے کی ممانعت ہے۔ حکمت اسی میں ہے کہ ید بیضا بغل میں رہے مگر میری دُعائے خیر ان تک پہنچ جائے گی۔ میں ان حضرات سے معافی کا خواستگار ہوں جو میری اس کاوش کو منجملۂ مخالفت و اعتراض سمجھیں۔ اِن سے میری یہی التجا ہے کہ اپنے گمان کو دُور کریں اور قابلِ اعتراض اُمور کی میری کوتاہی سمجھ کر اصلاح فرمادیں۔ ان کا یہ کرم میرے اور ان کے بلکہ سب کے حق میں مفید ہوگا ورنہ میری تسلی کے لئے یہی کافی ہے کہ یہ تنقید عقیدت مندی کی تاریکیوں کو کسی قدر چھانٹ دے گی یا انہیں اور زیادہ تنگ نظر بنا دے گی۔

میرا مدعا بیت بازی نہیں ہے بلکہ اتحاد بین المسلمین ہے۔

گر قبول افتد زہے عز و شرف

یہ رسالہ حضرت سید احمد شہیدؒ کی سوانح عمری نہیں ہے بلکہ ان تذکروں کی جو ان کے متعلق اس وقت تک لکھے گئے ہیں، ایک تنقید ہے جو نقائص مجھے نظر آئے، وہی پیش کر رہا ہوں۔ حاشا اس سے اعتراض مقصود نہیں۔ مدعا اصلی تصحیح ہے۔ یہ تمامیاں میرے خیال میں یوں وجود میں آئیں کہ سوانح نویسوں نے کیریکٹر کو نباہنے کی طرف توجہ نہیں کی۔ عقیدت مندی نے ذم کے پہلو کو سمجھنے نہیں دیا۔ کبھی آسمان کی کہہ دی اور کبھی زمین کی لکھ دی۔ یہ اپنے دعوے کو ثابت کرنے میں قطعی ناکام رہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ سید صاحب کی صحیح تصویر نہ کھنچ سکی اور ان کی عظیم شخصیت معمہ بن کر رہ گئی۔ ان کے سوانح یہی ظاہر کرتے ہیں کہ پیش ہر و و ہیچ۔ نہ انہیں مُلّا سمجھا جا سکتا ہے نہ طبیب بتایا جا سکتا ہے۔ نہ ولی کہا جا سکتا ہے اور نہ عالم۔ ضرورت ہے کہ سب سے پہلے ان کی شخصیت کا تعین کیا جائے کہ وہ کس طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ پھر اُسی معیار سے ان پر روشنی ڈالی جائے۔

وہ مرشد تھے، شاہ اسمٰعیل اور مولوی عبدالحی ان کی پالکی کو پکڑ کر ادباً پیدل چلا کرتے تھے لیکن بعد میں یہی ادب گستاخیوں میں منتقل ہوتا چلا گیا ہے۔ ان کے احکامات کی تعمیل نہیں کی گئی۔ گویا سید صاحب کی روحانیت شاہ اسمٰعیل کے ظاہری علم کی تعظیم کرنے لگی تھی۔ وہ ولی تھے؟ لیکن ان

کی کرامتیں معجزات سے مقابلہ کرتی نظر آتی ہیں۔ باوجود ان کی بے نفسی و عجز کے غصّہ و غضب کے آثار بھی دکھائے گئے ہیں۔ مدینہ منورہ میں بحالتِ خواب سیّد الکونین صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم سے جو بے تکی گفتگو کی ہے، اس میں ادب کا شائبہ نہیں۔ واقعہ پشاور کے بعد۔ وقتِ وداع سب کو بیعت سے آزاد کر کے۔ بہ ارشاد کہ "مجھے ان لوگوں سے نفرت ہے جیسے کسی کو قے سے ہو۔" معصومیّت اور ولایت کی مکمل تردید ہے۔ وہ بہادر اور سپاہی تھے؛ مگر سرحد میں وہ اپنی بہادری اور سپہ گری کے جوہر نہ دکھا سکے۔ وہ عالم تھے؛ انہیں وہبی علم حاصل تھا مگر وقتِ ضرورت ان کی علمیّت پردۂ اخفا میں رُوپوش ہوگئی۔ اخلاقِ کریمانہ کی دھوم ہے مگر جب داغ لگا ہوا گوشت سامنے آیا تو وال پر گذرگی اور پکانے والے کو سخت الفاظ سے یاد کیا غرض ان کے جملہ اوصاف میں تناقض دکھایا گیا ہے اور اس طرح انہیں معجونِ مرکّب بنا دیا ہے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ واقفیت کے لئے مولوی عبدالحی اور شاہ اسمٰعیل کا مختصر تعارف کرا دیا جائے کیونکہ اس ڈرامے کے یہی دونوں مخصوص کردار تھے۔ مولوی عبدالحی بھلت یا بڈھانہ ضلع مظفر نگر کے رہنے والے شاہ عبدالعزیز کے بھانجے، شاگرد، داماد اور معتقد تھے۔ مدرسہ رحیمیہ میں معلّم بھی رہے تھے اور میرٹھ میں انگریز کے دفتر میں محرّری بھی کی تھی۔ طبیعت کی متانت اور علمی فضیلت

کی وجہ سے انہیں فوقیت حاصل تھی۔ ان کی حیات میں سیّد صاحب کی تحریک ناموری کے ساتھ چلی۔

. . . .

. . . . . شاہ اسمٰعیل شاہ عبدالعزیز کے حقیقی بھتیجے تھے درسی کتب شاہ صاحب اور مولوی عبدالحی سے پڑھی تھیں۔ ابتدا میں کچھ دن سیّد صاحب کو بھی پڑھایا تھا۔ شاہ عبدالقادرؒ کے وصال کے بعد مسند درس ان ہی کو ملی تھی۔ ان سے اور مولوی محبوب علی و مولانا فضل الحقؒ سے چشمک رہا کرتی تھی۔ مولانا فضل الحقؒ سے یہ اٹھارہ برس بڑے تھے، ان کے وعظ جب جامع مسجد میں بند کر دیئے گئے تو احتجاج کرنے کے لئے یہ ریذیڈنٹ کے یہاں گئے، وہ ان سے مل کر بہت خوش ہوا، وعظ کی اجازت دے دی اور درخواست کی کہ کبھی کبھی تشریف لا کر عزت بخشتے رہا کیجئے۔ غالباً وہ ریذیڈنٹ سے مل کر سیاسی حالات پر بھی تبادلۂ خیالات کیا کرتے ہوں گے۔ سکھوں کے مظالم کی تحقیق کرنے کے لئے خفیہ طور پر اُنہوں نے پنجاب کا دورہ بھی کیا تھا۔ جہاد کی نیت سے تکلیفیں اُٹھانے کا بھی اپنے آپ کو عادی بنا لیا تھا۔ شہ سواری سپہ گری، پہلوانی اور تیراکی میں کمال رکھتے تھے۔ تبلیغ کی ابتدا نیچے کے طبقے سے شروع کی تھی اور بدمعاشوں اور طوائفوں کی اصلاح کو ان کے نزدیک اوّلیت حاصل تھی۔ شروع شروع

میں وحدت الوجود کے قائل تھے۔ رسالہ عبقات اس سلسلہ میں لکھا تھا، ان کے نئے خیالات کی وجہ سے شاہ عبدالعزیز، کچھ خوش نہیں تھے۔ یہی وجہ ہے کہ باوجود ان کی ذہانت و قابلیّت کا اعتراف کرنے کے انہیں اپنا جانشین نہیں بنایا اور اپنا سجادہ اپنے نواسے شاہ محمد اسحٰق کو دیا۔ سرحد کے جہاد میں شاہ اسمٰعیل کے ہی علم و فن سے جو کچھ ہُوا وُہ ہُوا۔

۱۔ اُردو میں سیّد صاحب کا سب سے پہلا تذکرہ سوانح احمدی یعنی تاریخ عجیبہ ہے جو مولوی محمد جعفر تھانیسری کی تصنیف ہے۔ وُہ کئی بیش بہا کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان کی قابلیت میں کلام کی گنجائش نہیں۔

سیّد صاحب کے حالات کے متعلق جتنا مواد ممکن تھا۔ وہ انہوں نے فراہم کر لیا تھا۔ جیسا کہ خود انہوں نے اظہار کیا ہے۔ ان کی تحقیق قابل داد ہے۔ ان کے تدیّن کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ سیّد صاحب کی ناکامی کے اسباب جو ان کی سمجھ میں آئے وہ صاف صاف لکھ دیئے بہ خلاف ان کے دُوسرے تذکرہ نویس سخن سازی و تاویل کے ذریعہ ناکامی پر پردہ ڈالنا چاہتے ہیں۔ سولہ برس کی عمر میں انہوں نے تقویۃ الایمان پڑھی اور اس جماعت پر ایمان لائے تھے۔ مولانا ولایت علی عظیم آبادی کی جماعت میں شمار کیے جاتے ہیں۔ کالے پانی کی سزا اُن کو دی گئی تھی اور رہائی پاکر ہندوستان آئے تھے۔

۲۔ حیات طیبہ میں مرزا حیرت دہلوی نے تمام سہرے شاہ اسمٰعیل کے سر باندھے ہیں اور اس کے ضمیمہ میں ادب و عقیدت مندی کے ساتھ

سید صاحب کا ذکر خیر کیا ہے اور بات بھی یہی ہے کہ ولی اللّٰہی تحریک کے اجزاء ہیں مولوی عبدالحئی اور شاہ اسمٰعیل کو سید صاحب پر تقدم حاصل تھا۔ اس تذکرہ کی روایات میں بعض جگہ اختلاف ہے لیکن اس کی وجہ سے یہ رائے قائم کرنا کہ ان کا ذریعہ معلومات غلط تھا صحیح نہیں (اور نہ ان کی رائے اور معیار کو غلط سمجھا جا سکتا ہے)

۳۔ سیرت سید احمد شہید۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی صاحب کے رشحات قلم کا نتیجہ ہے۔ وہ سید صاحب کے خاندان کے چشم و چراغ ہیں سید صاحب کے متعلق جو خانگی روایات تھیں، وہ بھی درج کی گئی ہیں۔ اسی لئے دوسرے تذکرہ نویسوں پر انہیں فوقیّت حاصل ہے نہایت خوبی و احتیاط سے انہوں نے حالات لکھے ہیں۔ مگر کیریکٹر کو نہ نباہ سکے اور تناسب جاتا رہا۔

۴۔ مولانا غلام رسول مہر صاحب کی "سید احمد شہید" معرکتہ الآرا ضخیم تالیف ہے، بڑی جانکاہی سے معلومات فراہم کی ہیں۔ اور بڑے ذوق و شوق کے ساتھ مفصّل حالات لکھے ہیں، ان کا ذخیرہ معلومات لاجواب ہے اور ہر معاملہ و واقعہ کو اتنی وضاحت و قابلیّت سے لکھ دیا ہے کہ پڑھنے والوں کو اپنی ذاتی رائے قائم کرنے کی زحمت نہیں گوارہ کرنی پڑتی۔ صحیح ربط و مدارج کا ان کے یہاں بھی پتہ نہیں چلتا۔ جس کی وجہ سے صحیح تصویر نہ اُتاری جا سکی۔ ان چاروں کتابوں کو ایک ساتھ پڑھا جائے اور موازنہ کیا جائے تو دماغ چرخ ہو کر رہ جاتا ہے اور کوئی رائے

قائم نہیں کی جا سکتی۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کل داستان فرضی اور مصنوعی ہے اور طلسم ہوشربا کا نمونہ ہے۔ ہر مؤلف نیا ترانہ الاپ رہا ہے۔ ان حضرات نے محض اپنے نظریہ کے مطابق روایات کا انتخاب کیا ہے۔ اور بقیہ روایات کو نظر انداز کر دیا ہے، ضرورت تھی کہ دقّتِ نظر سے جملہ روایات پر تنقید کر کے نتیجہ نکالا ہوتا، تاکہ ہر پہلو سے تذکرہ قابلِ وقعت ہوتا۔ اس میں شک نہیں کہ سید صاحب کی ہستی برگزیدہ تھی۔ وہ اپنی کیفیات میں محو رہ کر اصلاح کرنا چاہتے تھے۔ این و آں کی انہیں پرواہ نہیں تھی، مگر حاشیہ نشین اور ارادتمند اُن کی اصلاح کو مادی آنکھوں سے دیکھا کرتے تھے اور عجیب انداز سے بیان کیا کرتے تھے جس کی وجہ سے یہ مضمون صادق آیا کہ:۔

"ولیکن قلم در کفِ دشمن است"

شاہ اسمٰعیل کو ترجمانی کرنے میں ید طولےٰ حاصل تھا۔ سید صاحب کے اصولوں کو انہوں نے ہی اپنی قابلیّت سے اپنی زبان میں ادا کیا ہے معلوم ہوتا ہے کہ مولوی عبدالحی کی حیات میں شاہ اسمٰعیل احتیاط سے کام لیتے تھے مگر مولوی عبدالحی کی عدم موجودگی میں اور ان کی وفات کے بعد وہ مختارِ کُل بن گئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ سیّد صاحب کے حالات مولوی عبدالحی کی وفات سے پہلے اور وفات کے بعد دو لخت نظر آتے ہیں۔ بحر اور قافیہ کا لحاظ نہیں رہا اور وزن بھی بگڑ گیا۔ مولانا عبیداللہ سندھی نے اسی حقیقت کو اپنی سیاسی زبان میں اس طرح ادا کیا ہے کہ مولوی عبدالحی کی وفات کے بعد مرکزِ دہلی کی اہمیت جاتی رہی۔ دہلی سے یعنی شاہ محمد اسحٰق

سے تعلقات منقطع کر لئے گئے اور نیا مرکز سرحد میں بنا لیا گیا۔ مطلب یہ ہوا کہ شاہ اسمٰعیل کی علمیت و مصلحت اجازت دیتی تھی کہ سید صاحب کی تصویر جس رنگ میں چاہیں کھینچیں۔ واقعہ یہ ہے کہ شاہ عبدالعزیزؒ نے جب شاہ اسمٰعیلؒ کے بجائے شاہ محمد اسحاق کو اپنا جانشین بنایا تو کوئی وجہ نہیں کہ شاہ اسمٰعیل کو تحت شعور میں مایوسی نہ ہوئی ہو۔ ایسی حالت میں شاہ اسمٰعیل کو اپنی وجاہت قائم رکھنے کے لئے نیا راستہ بنانا تھا اور وُہی بنا بھی لیا ابتدا میں مولوی عبدالحی کی سرپرستی حاصل کر کے شاہ محمد اسحٰق سے ملتے رہے اور امتیاز حاصل کرنے کے لئے جہاد کا منصوبہ گانٹھا۔ سید صاحب کے مرید ہونے کے بعد تعلقات ترک نہیں کئے بلکہ ایک قسم کا بُعد اختیار کیا، آخرکار سید صاحب کے پردوں پر اُڑنے لگے باوجود سید صاحب سے بیعت کر لینے کے ان کی فضیلت علمی اور مصلحت بینی نے سید صاحب کا کلی طور پر اتباع نہیں کیا اور اس کو اتفاق ہی کہنا چاہیئے کہ جہاد کو جاتے ہوئے مولوی عبدالحی کو اجمیر سے دہلی بھیج دیا گیا اور تمام تر ذمہ دار شاہ صاحب ہی بنا دیئے گئے لیکن اس سب کے باوجود شاہ اسمٰعیل کے کارناموں میں سید صاحب کی علویت جھانکتی ہوئی نظر آجاتی ہے۔ ضرورت ہے کہ سید صاحب کے حالات علیحدہ کر کے خالص سید صاحب کے رنگ میں دکھائے جائیں۔ سید صاحب صُلح کل تھے، امن کے حامی تھے اور اتحاد بین المسلمین کو فروغ دے کر توحید کی لا انتہا و بے پناہ وسعت کو چمکانا چاہتے تھے مگر اتنی مدت مدید کے بعد تاریکیوں میں سے ان کے درخشاں

اصولوں کو علیحدہ کرنا بہت مشکل ہے۔ مگر ممکن ہے۔ عجائب پرستی نے ان کے حالات پر پردہ ڈال رکھا ہے۔ اب یہی ہو سکتا ہے کہ ان تذکروں سے خرافات دُور کر کے سید صاحب کی خصوصیات کا لحاظ رکھ کر ان کے حالات جمع کئے جائیں تاکہ سید صاحب کی عظمت نمایاں ہو سکے۔ خس و خاشاک چھانٹ کر ان کے اوصاف حمیدہ کی نشاندہی کرنا اس رسالہ کے ذریعہ میرا کام ہے۔ کوئی اہلِ ہمّت جس کو اللہ تعالیٰ توفیق دے، سید صاحب کے گوہر گرانمایہ کو صاف صاف منظر عام پر پیش کر دے تو بعید نہیں۔

ان صاحبان نے فروعی مسائل میں اپنی جدّتوں سے جو انقلاب پیدا کرنا چاہا ہے۔ اس کی تردید علماء اہل سنّت نے کی ہے اور جواب میں حدیث و قرآن سے استدلال کر کے بہترین مواد جمع کر دیا ہے لیکن نتیجہ نہیں نکلا۔ اس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ علماء اہل سنّت نے ان حضرات کی تعلیم کو پوری طرح نہیں سمجھا۔ یہ تعلیم جو سیّد صاحب سے منسوب کی جاتی ہے۔ شریعت و طریقت دونوں سے مرکب ہے۔ واضعان تعلیم طریقت کے اصولوں سے سطحی طور پر واقف تھے۔ لہذا علم معقول کے ذریعہ طریقت کی جو گت انھوں نے بنائی ہے وہ بے تکی اور ناقص ہے۔ علماء اہل سنت خود ان کی اس طریقت کی تہ کو نہیں پہنچے اسی لئے طریقت والے حصّہ پر انھوں نے خاص توجہ نہیں کی، اگر وہ اس کا بھی لحاظ رکھتے تو یقین ہے کہ خلیج پٹ جاتی۔ اور افہام و

وتفہیم کی شکل نکل آتی ۔ اصلاح کی خاطر یہ کام آج بھی کیا جا سکتا ہے ۔ بشرطیکہ فریقین کٹ حجتی اور ہٹ دھرمی سے کام نہ لیں اور ایک دوسرے کی ذاتیات پر اخلاق سوز حملہ نہ کریں ۔ اصل مقصود کو چھوڑ کر فروعات کی خاطر وحدتِ اسلامی کو خطرے میں ڈالنا مذہب اسلام کی توہین ہے اور انسانیت کی تذلیل ہے ۔ تقاضاء فتنہ طرح طرح سے شیر وشکر ہو جانے کی ہدایت کر رہا ہے ۔ اب بھی اگر آیاتِ الٰہی پہ توجہ نہیں کی گئی اور سبق حاصل نہیں کیا گیا تو نتیجہ معلوم ۔ ڈوبنے والی کشتی ڈوبنے سے بچ نہیں سکتی ۔

فاعتبروا یا اولی الابصار

ہیچمیرز

وحید احمد مسعود قطبی صابری شیخوپور بدایوں

یکم جولائی سنہ ۱۹۶۵ء مطابق یکم ربیع الاول ۱۳۸۵ھ

پہلا باب

کینت و تربیت

رائے بریلی کا مشہور و معروف قطبی خاندان سادات کسی تعارف کا محتاج نہیں ۔ شہنشاہ اورنگ زیب کے عہد میں شاہ علم اللہؒ جو شیخ آدم بنوریؒ کے خلفاء میں سے تھے ۔ اُن کی اولاد میں متعدد بزرگ علوم ظاہری و باطنی میں کمال رکھتے تھے ۔ سید نعمانؒ وغیرہ نے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور ان کے صاحبزادگان سے استفادہ کیا تھا ۔ سید نعمانؒ کے بھائی سید محمد عرفانؒ زہد و تقوے میں مشہور تھے ۔ ان کے گھر یکم ماہ محرم یا ماہ صفر ۱۲۰۱ھ مطابق ۱۷۸۶ء میں رحمتِ پروردگار سے ہُن برسا ۔ ہر مولود اپنی فطرت اپنے ساتھ لایا کرتا ہے اور خاندان کے موروثی اثرات بھی اس کی جبلّت میں شامل ہُوا کرتے ہیں ۔ اگر اس کا رجحان خاندان و ماحول کے ظاہری طرز و طریق کے مطابق ہوتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات ۔ ورنہ ایک طرح کی مایوسی سے سابقہ پڑا کرتا ہے ۔ سید محمد عرفان کے ان صاحبزادے کا نام سید احمد رکھا گیا ۔ ان کے نئے اور عجیب انداز تھے ۔ عالمِ شیر خوارگی میں عام بچوں کی طرح نہ بسورتے تھے اور نہ مسکراتے

تھے ۔ اِن کے بڑے بھانجے سید محمد علی عمر میں ان سے بڑے تھے ۔ انہوں نے اپنی کتاب مخزن احمدی میں لکھا ہے کہ ان کی تعلیم مکتب میں شروع ہوئی مگر انہوں نے کچھ پڑھ کر نہ دیا ، آخرکار تین برس کی تعلیمی کوشش کے بعد ان کے والد صاحبؒ نے فرمایا "انہیں خدا پہ چھوڑ دو ۔ وہ ان کے حق میں جو بہتر سمجھے گا کرے گا" یہ فقرہ بول رہا ہے کہ ان صاحبزادے کی باطنی صلاحیت کو انہوں نے سمجھ لیا تھا ۔ جس کو اور لوگ نہیں سمجھ پائے تھے ۔ قرآن پاک ناظرہ پڑھایا گیا تھا ، اس کی چند سورتیں یاد ہو گئی تھیں اور بس ۔ بے ذوقی اور بے رغبتی ان کے حرکات و سکنات سے ظاہر تھی اہل وآں کی پرواہ نہیں تھی ۔ یہی وجہ ہے کہ ان پر مزید توجہ نہیں کی گئی ۔ ان کی استعداد اور صلاحیت پر غور کرنے کا بھی کسی نے خیال نہیں کیا ۔ لہٰذا ان کے ابتدائی حالات کون سے ایسے تھے کہ حافظے میں محفوظ رہتے ۔ تعلیم سے رہائی پاکر اُن کے دو شغل تھے ۔ ہمجولیوں کے ساتھ کبڈی وغیرہ کھیلنا ، تمام گھروں میں جگہ لگانا ، سیدھا سادا سمجھ کر بستی والے اپنے نجی اور ذاتی کام ان سے لے لیا کرتے تھے اور وہ خوشی خوشی سب کا سودا سلف بازار سے لا دیا کرتے تھے ۔ یہ شوق خدمت گزاری اتنا بڑھا کہ کل بستی کے محبوب بن گئے ۔ کسی کے ہنسنے یا طعن و تشنیع کی انہیں پرواہ نہیں تھی بلکہ وہ اچھی بری نظروں کو بھی نہیں پہچانتے تھے ، انہیں

تو محض اپنی دُھن سے کام تھا۔ جیسا پہننے کو مل جاتا، پہن لیتے جیسا کھلا دیا جاتا، کھا لیتے۔ البتہ کلیجی کھانے کا شوق تھا۔ جب سترہ اٹھارہ سال کے ہوئے تو والد کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ والدہ صاحبہ چچاؤں اور بھائیوں کی نگرانی میں کئی برس جوں توں گذارے۔ آخر کار ایک مرتبہ جو تنگ اُٹھے تو سات ہمجولیوں کو لے کر تلاشِ روزگار کے لئے وطن سے چل دیئے اور چلتے چلتے لکھنو پہنچ گئے۔ چار و ناچار وہاں کم و بیش سات مہینے گزارے۔ جب جی نہ لگا تو ایک دن سوتے جیسے بہ یک بینی و دو گوش راہ فرار اختیار کی۔

سنہ ۱۲۲۲ھ / ۱۸۰۷ء میں یہ یگانہ دہلی میں نمودار ہوا۔ دہلی پہنچنا یوں ہوا تھا کہ گھر والوں سے شاہ عبدالعزیزؒ کے اذکار سُنے تھے۔ شاہ عبدالعزیزؒ نے ان کے خاندان سے واقفیت رکھنے کی وجہ سے محبت و شفقت کے ساتھ انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ سر آنکھوں پر بٹھایا اور تعلیم کے لئے اپنے بھائی شاہ عبدالقادرؒ کے پاس اکبری مسجد میں بھیجدیا۔ مدرسہ میں کچھ دن شاہ اسمٰعیل کے سامنے بھی سیّد صاحب نے زانوئے ادب تہ کیا تھا۔ یہاں بڑی حیرت کے ساتھ نئی بات یہ دیکھی کہ خلافِ شرع سب لوگ بجائے السلام علیکم کے آداب و تسلیمات کیا کرتے تھے۔ چنانچہ اس غلطی پر سب کو ٹوک بھی دیا۔ یہاں جتنی بھی کتابیں پڑھائی گئی ہوں مگر نتیجہ صفر تھا۔ کہتے ہیں کہ کافیہ تک پڑھا تھا اور بعض کا خیال ہے کہ مشکوٰۃ شریف بھی پڑھی تھی، بے دلی کا حال سُن کر

شاہ صاحب نے انہیں اپنے پاس بلایا اور ان کی استعداد کا رُوحانی صُورت سے جائزہ لے کر فرمایا "یہ اس دُنیا کے آدمی نہیں ہیں" اس کے بعد رُوحانی توجّہ فرما کر انہیں اپنا مرید کر لیا، اس کے معنی یہ ہوئے کہ دُنیا کو فائدہ پہنچانے کے لئے انہیں مرید کیا، بعد بیعت اسی غرض سے مجاہدات کے لئے انہیں حجرے میں بٹھا دیا۔ ان کی مجذوبیت کو اس طرح راہ راست پر لانا تھا اور پھر اپنے فیض صحبت سے بھی سرفراز کرنا تھا۔ قیام دہلی کی مدّت ڈیڑھ سال یا دو سال بتائی جاتی ہے۔ اس عرصہ میں سیّد صاحب کی حالت بدل گئی اور کچھ سے کچھ ہو گئے۔ اس تغیّر کا باعث شاہ صاحب ہوئے۔

اتنی سی بات تھی اسے افسانہ کر دیا۔

دُوسرا باب

بیعت کی روئداد

صحیح طور پر نہیں بتایا جاسکتا کہ سیّد صاحب نے از خود بیعت کی درخواست کی تھی یا شاہ صاحب نے خود اپنی مرضی سے انہیں مرید کیا تھا۔ سوانح احمدی کا بیان ہے کہ سیّد صاحب نے طریقۂ نقشبندیہ میں شاہ صاحب کے ہاتھ پر بیعت کرنا چاہی تو انہوں نے فرمایا "اگرچہ اس صاحب باطن کو رشد و ہدایت کے لئے وسیلہ کی احتیاج نہیں ہے مگر اہلِ ظاہر کی رفع حجّت کے لئے بیعت لئے لیتا ہوں"۔ سیاق و سباق سے معلوم ہوتا ہے کہ سیّد صاحب کی درخواست پر یہ جواب دیا ہوگا اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ یہ فقرہ دوسروں کو یوں سنایا کہ مرید کرنے کی تمنّا کی توجیہہ ہو جائے لیکن جو کچھ کسی نوعیّت سے بھی فرمایا وہ بے اصولی بات ہے۔ شاہ صاحب کے مذہب میں یقیناً رشد و ہدایت کے لئے وسیلہ کی احتیاج لازمی ہے۔ اہل طریقت کبھی ہرگز اس بیان کو تسلیم نہیں کر سکتے لہٰذا اس فقرے سے شاہ صاحب کی توہین ہو جاتی ہے۔ بہرحال کہنے والوں نے کسی مصلحت سے ایسا ہی لکھا ہے اور جہاں تک شاہ صاحب کے اصول اور معتقدات کا تعلق ہے، یہ قطعی غلط ہے۔ وہ ایسا فقرہ کہہ ہی نہیں سکتے تھے۔ ۱۲۲۲ھ میں جبکہ سیّد صاحب کی عمر اکیس سال کی

تھی تو ان کو بیعت نصیب ہوئی تھی۔ پہلے دن لطیفۂ قلب کی تعلیم فرمائی گئی۔ دوسرے دن باقی پانچوں لطیفے کھل گئے۔ تیسرے دن سلطان الاذکار کی منزل طے ہوئی۔ چوتھے جلسہ میں نفی و اثبات باحسن وجوہ حاصل ہو گیا۔ پانچویں دن کے متعلق کچھ نہیں لکھا گیا ہے۔ غالباً آرام کرنے کے لئے چھٹی رہی ہو گی۔ چھٹے جلسہ میں طریق یادداشت پر عبور ہو گیا۔ ؎ۃ۔ اس کے بعد شغل برزخ (تصور شیخ) تعلیم کرنا چاہا تو سید صاحب نے منت و سماجت کے ساتھ عرض کیا کہ: "یہ ایک قسم کی بُت پرستی ہے، مجھے معذور رکھا جائے"۔ اس پر شاہ صاحب نے سمجھانے کے لئے حافظ شیراز کا وہ شعر سنایا۔ جس کا مصرع ہے

بہ مے سجادہ رنگین کن گرت پیر مغاں گوید

مگر بجائے حکم ماننے کے استدلال کیا کہ مے نوشی کے حکم کی تعمیل کر سکتا ہوں، اگرچہ گناہ کبیرہ ہے مگر تصور شیخ جیسا شرک مجھ سے ممکن نہیں لیکن اس کے جواز میں کوئی سند قرآن و حدیث یا اجماع کی بتا دی جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ یہ جواب سید صاحب کی فطرت اور قابلیت کے قطعی خلاف ہے (اس حکم عدولی و نادانی پر) شاہ صاحب نے اپنی بغل میں لے کر سید صاحب کے رخسار و پیشانی کو بوسے دیتے ہوئے فرمایا کہ "اے فرزند ارجمند! حق تعالےٰ نے اپنے فضل و کرم سے ولایت اولیا اور ولایت انبیا تم کو عطا کی"۔ کوئی اہل نظر تو اس سلوک و اخلاق کے معنی سمجھ ہی نہیں سکتا۔ سوال دیگر جواب دیگر کی بو اس میں آ رہی ہے

؎ۃ حضرت مجدد سرہندی رح نے یہ منازل ڈھائی مہینہ میں طے کئے تھے۔

یہ سُن کر سیّد صاحب نے دریافت کیا کہ "ولایت اولیا اور ولایت انبیا کسے کہتے ہیں اور دونوں میں کیا فرق ہے؟"[1] یا تو وہ کمالِ باطن کہ تصوّرِ شیخ سے انکار یا یہ لاعلمی کہ ولایتوں کا فرق پوچھنا پڑا۔

بہ حیرتم کہ عجب تیر بے کماں زدہ است

عام طور پر اس بیعت کی خصوصیات پر غور نہیں کیا گیا۔ یہ بیعت نہیں بلکہ تماشہ ہے۔ اسی وجہ سے سیّد صاحب کا طور و طریقہ بھی سمجھ میں نہیں آتا۔ عقیدت مند اس بیعت کی خود وضاحت نہ کر سکے۔ اگر وہ صاف طرح سے تشریح کر دیتے تو مغالطے نہ پیدا ہوتے اور اصول واضح ہو جاتا۔ ان کے مخالف علما نے بھی اس طرف توجہ نہیں کی۔ انھوں نے بظاہر بیعت کو رسم قرار دیا اور اس کے اصلی و باطنی معنی کو قابلِ التفات نہیں سمجھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اغیار ہی نہیں بلکہ پرستار بھی بیعت کی حقیقت سے ناواقف ہیں۔ مگر بہ گشتن روزِ اوّل کے اصول پر اس معمہ کو حل کرنے کی ضرورت ہے۔ شاید کہ ہمیں ہضمہ برآرد پر و بال۔ عام دستور کے مطابق بیعت کے معنی ہیں۔ دِل بدست دگرے دادن و حیران بودن۔ بیع ہو جانے کے بعد مرید غلام بن جاتا ہے اور اسے چوں و چرا کا حق نہیں رہتا۔ ہر حال میں اسے مرشد کے حکم کی تعمیل کرنا پڑتی ہے۔ اس بیعت میں پہلا اعجوبہ یہ ہے کہ شاہ صاحب نے فرمایا کہ اس صاحبِ باطن کو اتمامِ حجّت کے لئے بیعت کئے لیتا ہوں اگر وہ صاحبِ باطن تھے تو یہ بیعت ان کی ذلّت تھی اور جائز نہیں

---

[1] مخزنِ احمدی و وقائع

ہو سکتی - بیعت صفائی باطن کے لئے کی جاتی ہے جس کا باطن پہلے ہی سے صاف ہو اس کے لئے بیعت بے معنی ہے - صاحب باطن کو بیعت کرنا فعل عبث ہے جس کے شاہ صاحب مرتکب کبھی نہیں ہو سکتے تھے اگر کسی خاص مصلحت کی وجہ سے اس کی ضرورت تھی تو صاحب باطن کو اس مصلحت کا پردہ رکھنا تھا، لیکن جو تکرار کی گئی، وہ صاحب باطن کی شان کے خلاف ہے۔ شغل برزخ کے متعلق جو حجت کی اس سے نتیجہ یہی نکالا جا سکتا ہے کہ مرید معترض ہو کر مرشد کی اصلاح کرنا چاہتا ہے جو جواب سید صاحب نے دیا، وہ ایک معقولی مولوی ہی دے سکتا ہے - صاحب باطن کے منہ سے ایسی بات نکل ہی نہیں سکتی - اس قسم کی حجت بازی مدرسوں میں ہوا کرتی ہے - میخانۂ طریقت میں ایسا رواج نہیں ہے۔ شاہ صاحب کو ان کے انکار پر حق تھا کہ کہہ دیتے -

جس کو ہو جان و دل عزیز میری گلی میں آئے کیوں

مگر یہ اُن کی شان بزرگی اور طریقت کے خلاف تھا - لہٰذا نادانی کی بات کو نظر انداز کر دیا اور ادب سکھانے کے لئے حافظ کا شعر سُنا دیا مگر وہاں اتنا شعور کہاں تھا کہ مفہوم سمجھا جاتا، یا یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ ولایت کا اس قدر بلند درجہ حاصل تھا کہ وہاں شاہ صاحب کی تہدید و تنبیہ گذر نہ تھا - شاہ صاحب نے اصولاً سکوت اختیار کیا اور بغل میں لے کر رخسار و پیشانی پر بوسے ثبت فرما دیئے - آخر اس کے معنی کیا ہوئے لاجواب ہو کر شرمندگی کو دُور کیا یا صاحب باطن کو داد دی کہ اعتراض صحیح ہے؟

یہ بوسہ بازی بذاتِ خود ایک رازِ سربستہ ہے۔ اس کے بعد مژدہ سُنانا
بھی چیستان ہے کہ تمہیں حق تعالےٰ نے دونوں قسم کی ولایتوں سے سرفراز
فرمایا۔ یہ صلہ ہے بوسوں کا یا بوسوں سے ماسوا ہے؟ پھر یہ بھی ایک مضحکہ
خیز گو مگو کا معاملہ ہے کہ صاحب باطن نے دونوں ولایتوں کا فرق معلوم
کرنا چاہا۔ خدا جانے یہ تجاہلِ عارفانہ تھا یا شاہ صاحب کی آزمائش منظور
تھی؟ ممکن ہے کہ یہ مصلحت ہو کہ صاحب باطن خود ولایت کی تفسیر بیان
کرتے تو وہ ملکوتی زبان میں ہوتی اور کسی کی سمجھ میں نہیں آتی، لہٰذا شاہ صاحب سے
تشریح اس لئے کروانا چاہی کہ وہ عام فہم ہوگی اور قبولیت عامہ حاصل
کرے گی۔ صاحب "سیّد احمد شہید" نے ص۱۷۱ کے نوٹ میں باوجود طریقت
سے ناواقفیت کا اقرار کرتے ہوئے اظہارِ خیال فرمایا ہے کہ "شاہ
صاحب سمجھ گئے کہ یہ دوا سیّد صاحب کے مزاج کے سازگار نہ ہوگی،
کیونکہ سیّد صاحب کی طبیعت اتنی پاک و مزکّٰی تھی کہ تصورِ شیخ کو قبول
نہ کرسکی، لہٰذا اُسے چھوڑ دیا اور تصورِ شیخ کی ضرورت نہیں سمجھی"۔ حکیم و
طبیب کے متعلق اس قسم کا تصور باندھا جاسکتا ہے لیکن طبیب رُوحانی
کے متعلق ایسا خیال قائم کرنا ظاہر کرتا ہے کہ گویا طبیبِ روحانی اصول
طریقت سے ناواقف ہے۔ طبیعت جس کی پاک اور مزکّٰے ہوتی ہے
وہ تصورِ شیخ کو بآسانی قبول کرلیا کرتا ہے اور طبیب روحانی یعنی شیخ
طبیعت کو پاک و مزکّٰے بنانے کے لئے ہی تمام پاپڑ بیلا کرتا ہے لیکن اگر

ان کے استدلال کو تسلیم کر لیا جائے تو کہنا پڑے گا کہ مولانا غلام رسول مہر صاحب بنیادی خیال کو نہیں سمجھے اور نہ شاہ صاحب کی تعلیم تک ان کی رسائی ہوئی۔ غرض یہ اظہار رائے بڑی جرأت کا کام ہے اور ایسی جرأت صاحب علم و نظر نہیں کیا کرتے۔ یہ سمجھنا کہ شاہ صاحب نے سید صاحب کے اعتراض کو تسلیم کر لیا یا لاجواب ہو گئے یا سید صاحب کی رعایت کر کے خاموش ہو گئے۔ نادانی کی بات ہے، اس سے یہ سمجھا جائے گا کہ شاہ صاحب نے اپنے اصول کو شاہ ولی اللہ کی تعلیم کو حضرت امام ربانی سرہندی کے طریقہ کو اور چاروں سلسلوں کی تعلیمات کو غلط ثابت کر دیا۔ کیونکہ یہ سب تصور شیخ کے قائل و عامل ہیں۔ بغل میں لے کر بوسوں کو ثبت کرنے کا مقصد پرانے اصول کے مطابق یہی ہو سکتا ہے کہ اس طرح اپنی روحانیت سے جاہلانہ اعتراض کو باطل کر دیا۔ اور خود اپنا تصور القا فرما دیا۔ سید صاحب کے حالات میں بھی آئندہ چل کر اسی قسم کی شہادتیں موجود ہیں۔ اسی اصول پر مولوی مرتضےٰ کو سینہ سے وصل کر کے سید صاحب نے خود تسکین دی ہے۔ اور میاں محمد حسین کا اقرار صاف موجود ہے کہ جس وقت میں نے بیعت کی اس وقت مجھ پر اپنا وجود منکشف ہو گیا اور پھر دل میں نظر ڈالتا تھا تو سید صاحب ہی سید صاحب نظر آتے تھے (سیرت احمد شہید ص ۲۷۵) مولوی رشید احمد گنگوہی

ؔ رسالہ لیاقوتہ لواسطہ میں مولانا احمد رضا خاں بریلوی نے شغل برزخ کے متعلق قرآن پاک، حدیث شریف۔ نقوال علماء خصوصاً مندرجہ بالا حضرات سے اور صراط مستقیم کے حوالے سے مفصل ثبوت بہم پہنچایا ہے۔ حاجی امداد اللہ کا ارشاد نمبر ۹۵ امداد المشتاق کے صفحہ ۷۶ پر ہے فرمایا کہ لوگوں نے تصور شیخ کو کفر و شرک لکھا ہے۔ بدلیل ما ہذہ التماثیل التی انتم لہا عاکفون اور تصور نور کو روا رکھا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ عوام کی نظر ظاہر پر تھی لہٰذا زجر کیا گیا اور نظر صوفی کی باطن اور حقائق پر ہوتی ہے۔ شیخ چونکہ میزاب رحمت الٰہی ہے عارف اس سے آب فیض حاصل کرتا ہے اور میزاب پر توجہ بالذات نہیں رکھتا۔ اگر شیخ غیر ہے۔ تو نور بھی غیر ہے پس یہ ترجیح بلا مرجح ہے۔

"ارواحِ ثلثہ" کے صفحہ ۲۹ پر فرماتے ہیں کہ "تین سال کامل حضرت حاجی امداد اللہ کا چہرہ قلب میں رہا اور میں نے بغیر اس سے پوچھے کوئی کام نہیں کیا"۔ یہ آخری فقرہ محیر العقول ہے، اس کے معنی ہوئے کہ تصور بولتا تھا اور جواب دیتا تھا۔ کمال کے اس درجہ کو حاصل کرنے کے بعد حیرت ہے کہ جناب گنگوہی صاحب ایسی رجعت قہقری فرمانے پر کس طرح آمادہ ہو گئے جیسی کہ ان کے عقائد اور فتووں سے ظاہر ہوتی ہے۔ بہر حال مفہوم و مطلب کچھ ہی ہو، اس بغلگیری یا ہم آغوشی اور بوسہ لینے کے بعد شاہ صاحب نے مژدہ سنایا تھا لیکن وہ مژدہ مبہم ہے۔ معلوم نہیں کہ پہلے سے دونوں ولایتوں کے حاصل ہونے کی مبارکباد ہے یا یہ انعام الٰہی بہ برکت بیعت ابھی حاصل ہوا ہے یا یہ کہ آئندہ مراتب کے حصول کے متعلق یہ پیشگوئی کی گئی ہے۔ فرمایا گیا ہے کہ سید صاحب کی صفاء باطن تصور شیخ کی متحمل نہ ہو سکی مگر سورہ یوسف میں مذکور ہے کہ برہانِ الٰہی نے یوسف علیہ السلام کو زلیخا کے مکر سے بچا لیا یعنی حضرت یعقوب علیہ السلام سامنے آ کر انگلی کے اشارے سے منع کرتے ہوئے نظر پڑے۔ اسی برہان الٰہی کو تصور سے موسوم کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ قرآن پاک میں ذکر کرنے کی تاکید ہے۔ سلطان الاذکار اسی حکم کی تعمیل ہے۔ جسم کا رونگٹا رونگٹا ذکر کرنے لگتا ہے۔ اب اگر آنکھ بھی ذکر کرے تو بعید نہیں۔ اسی شغل عینی کا نام تصور ہے

یہ تصوّر استحکام محبّت کے لئے ضروری سمجھا جاتا ہے۔ اس کو شرک فی العلم کہنا صحیح نہیں۔ یہ آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔ جملہ وساوس اس سے دفع ہو جاتے ہیں۔ تصوّر کے کامل ہو جانے پر ہی عالم ملکوت کا دروازہ کھلا کرتا ہے۔ حدیث احسان تصوّر کے دو طریقے بتاتی ہے یعنی یہ کہ یا تو یہ سمجھو کہ خدا تعالیٰ تمہیں دیکھ رہا ہے یا یہ خیال جماؤ کہ تم اللہ جل شانہٗ کو دیکھ رہے ہو۔ اس ارشاد نبوی کے بعد تصوّر کو بدعت نہیں کہا جا سکتا اور نہ پھر اس کا تواتر اجماع اُمّت کی دلیل ہے۔ حضرت مجدّد سرہندی۔ شاہ ولی اللہ اور شیخ کلیم اللہ جہاں آبادی وغیرہم نے تصوّر شیخ کو صحیح ثابت کیا ہے۔ مولانا رُوم فرماتے ہیں

چوں خلیل آمد خیال یار من
صُورتش بُت بہ معنی اُو بُت شکن

اب بھی اس کے متعلّق بحث و تکرار اور قیل و قال ہے تو کہنا پڑتا ہے کہ آرے آرے می کنم یا شیخ و واعظ کار نیست

مرزا حیرت دہلوی اہل حدیث سے ہیں۔ انہوں نے پیری مریدی کے قصّہ کو ترک کر کے سیّد صاحب کو شاہ صاحب کا محض شاگرد ظاہر کیا ہے۔ مولوی جعفر تھانیسری کا یہ لکھنا کہ بیعت اتمام محبت کے لئے لی گئی۔ نہ اُوئی مرداں ہے نہ اُوئی زناں ہے لیکن اگر یہ بات انہوں نے رسمی طور پر لکھ دی ہے تو گویا انہوں نے بھی بیعت سے انکار کیا ہے اور اگر واقعی طور پر یہ بات لکھی ہے تو اس

کا مطلب یہ ہوگا کہ فنا فی اللہ ہونے کی وجہ سے سیّد صاحب کو نہ بعیت نفس کی ضرورت تھی اور نہ تصوّر شیخ کی۔ صاحب سیرت سیّد احمد شہید کو بعیت کا افراد ہے مگر تصوّر شیخ کے یہ تینوں حضرات منکر ہیں اور سیّد صاحب کے اعتراض کو صحیح سمجھتے ہیں۔ اسی لئے سیّد صاحب کی تعلیم کا سنگِ بنیاد بھی انکارِ تصوّر ہے۔ پھر اس سنگ بنیاد کو ولایتوں کے فرق سے تقویت پہنچائی گئی ہے۔ بتایا گیا ہے کہ سیّد صاحب کے دریافت کرنے پر شاہ صاحب نے ولایتوں کا فرق اس طرح سمجھایا تھا۔ ..... ولایت کی بنیاد محبّت پر ہے ..... پس صاحب ولایت وَلی قیام وصیام اور کثرتِ نوافل اور خدمتِ خلائق کے ذریعہ سے مجاہدہ نفس میں مشغول ہوتا ہے اور گوشہ گزینی کو محبوب و مرغوب رکھتا ہے۔ اور مجرمین و فاسقین سے تعرض نہیں کرتا۔ ایسے اعمال کو صوفیا، قرب النوافل کہتے ہیں اور اصحابِ ولایتِ نبی کے قلب میں اس قدر محبّت الٰہی قائم ہوتی ہے کہ غلبہ ایثار کی وجہ سے تمام رذائل و ظلمات نفسانی و جسمانی زائل ہو کر خصائل حمیدہ و سجایائے پسندیدہ سے متصف ہو جاتے ہیں۔ وہ ہدایت خلق، نصائح مجرمین اور اجرائے اقامتِ فرض الٰہی اور احیائے سُنن انبیا و مرسلین میں منہمک و مصروف ہو جاتے ہیں اور جہاد با کفار و تادیب اشرار و تعذیر گنہگاران کا شعار ہو جاتا ہے۔ کوئی سُنے یا نہ سُنے۔ وہ ہر مجلس میں دُعا و نصیحت جا کر سُناتے ہیں۔ اصطلاحِ صوفیہ میں اسے قرب الفرائض

کہتے ہیں اور یہ مرتبہ جملہ مراتب ولایت سے افضل و اعلیٰ ہے۔ ایسے بزرگوں کا عمل قرآن و حدیث و نصوصِ صریح پہ ہوتا ہے۔

یہ وہ بیان ہے جو صراطِ مستقیم کے مقدمہ میں بالتفصیل درج ہے اور جو اس سے پہلے تقویۃ الایمان میں بھی لکھا تھا۔ اس میں صاحب ولایت و ولی کی جو تعریف بتائی گئی ہے۔ اس سے کسی کو بھی انحراف نہیں ہو سکتا مگر آگے بڑھ کر مزے کی نرالی تشریح کی گئی ہے کہ "اس میں ایک نکتہ ایسا باریک ہے کہ اس زمانے کے لوگ نہیں سمجھتے یعنی راہِ نبوت کو حُبِّ ایمانی کہا جاتا ہے اور راہِ ولایت کو حُبِّ عشقی۔ آئمہ طریقت پہلے قرآن و حدیث سے تحصیل کر کے سلوکِ راہِ نبوت میں جب پکے ہو جاتے ہیں تو سلوک راہِ ولایت یعنی حُبِّ عشقی کو شروع کرتے ہیں۔ ان دونوں ولایتوں میں تخالف نہیں ہے اور دونوں کی تعریف جو بیان کی گئی ہے وہ ہر طرح صحیح ہے مگر قابلِ لحاظ یہ امر ہے کہ راہِ نبوت یعنی حُبِّ ایمانی بُنیاد جڑ اور اصل ہے اور حبِ عشقی یا طریق راہ ولایت مثل نقش و نگار کے ہے جب راہِ نبوت کی عمارت تیار ہو جاتی ہے تو اس پہ راہِ ولایت کے گل بوٹے لگائے جاتے ہیں، اس سے پہلے گل بوٹے لگانا بیکار ہیں مگر اب جاہلِ فقرا اور نادان سالکوں نے ثانی کو اوّل مقرر کر کے سلوکِ راہِ نبوت کو بالکل ہاتھ سے دیدیا ہے اور شروع ہی سے راہِ ولایت عشقی میں پڑ کر برباد ہو گئے ہیں حالانکہ انّا لِلّٰہ ثم

مجاہدہ کی حدیث مشہور ہے کہ پہلے ایمان لاؤ اور پھر مجاہدہ کرو۔"
اس نکتہ باریک میں عجوبیت، جدت اور ایچ بھر دی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سخن درین است ابتدا سے جملہ بزرگان دین راہ ولایت یا حُبّ عشقی کو اول اور راہ نبوت یا حبّ ایمانی کو موخر مانتے چلے آئے ہیں۔ امداد المشتاق کے صفحہ ۹۸ کے نمبر ۲۰۳ پر درج ہے کہ مولوی اسمٰعیل رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ حُبّ ایمانی بعد وصول رو بہ ترقی ہوتا ہے اور حبّ عشقی زائل ہوتا ہے مگر میری رائے برعکس ہے۔ قال علی رضی اللہ عنہ لو کشف القناع ماازددت یقینا اور مولانا روم فرماتے ہیں۔ عشق دریائیست قعرش ناپدید۔ البتہ مولوی صاحب کا قول باعتبار عشق مجازی صحیح ہے کہ اس میں محبوب کے کمال کی حد اور انتہا مقرر ہے۔ ہو المحبوب الحقیقی لا یتناھی کمالہ۔
اب موخر کو مقدم اس جماعت اسمٰعیلیہ نے ظاہر کر کے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد علیحدہ بنائی ہے اور یہ ایجاد صراط مستقیم کی تصنیف کے زمانہ کی نہیں ہے بلکہ اس سے پہلے تقویۃ الایمان میں بھی اسی کی تشریح کی گئی تھی۔ یہ جدت سید صاحب کی بیعت سے پہلے کی ہے لہٰذا ستم ہے کہ قبل و بعد از وقت کی اپج کو سید صاحب کی بیعت کے وقت ظاہر کیا اور ستم بالائے ستم یہ ہے کہ شاہ صاحب کے اصول کے خلاف شاہ صاحب کے منہ سے اسکی کروائی گئی ہے۔ پھر کمال یہ ہے کہ ثبوت میں تصدیق کی غرض سے امنو ثم جاہد کی حدیث پیش کی گئی۔ حدیث صحیح ہے اس کا مطلب یہی ہے کہ ایمان و مجاہدہ علیحدہ علیحدہ ہیں اور ایک نہیں ہیں۔ مگر ان صاحبان نے معنوں کو

ایک ہی سمجھا ہے ، بہر حال مجاہدہ کا نتیجہ ولایت ہے اور ولایت کے چند اقسام ہیں مگر سوال یہ ہے کہ کونسا مجاہدہ کیا جائے۔ وہ جو قدیم سے چلا آیا ہے یا وہ جو صاحب تقویۃ الایمان نے ایجاد کیا ہے اس حدیث کو اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش کرنے کے معنی یہی ہیں۔
چہ دلاور است دزدے کہ بہ کف چراغ دارد۔ اس کے برعکس عام اور قدیمی خیال یہی ہے کہ ایمان لانے کے بعد جو مجاہدہ کیا جاتا ہے اس کو ولایت عامہ کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد ولایت خاصہ کا نمبر آتا ہے۔ ولایت خاصہ کی دو قسمیں ہیں۔ ولایت اولیا اور ولایت انبیا صوفیوں کے یہاں ولایت اولیا کو ہمیشہ سے تقدم حاصل ہے اور شاہ اسمٰعیل (یا سیّد صاحب) نے اپنی منطقی جدّت سے ولایت انبیا کو مقدم کر دیا ہے۔ ان کا یہ دعویٰ قطعی غلط ہے کہ آئمہ طریقت پہلے راہِ نبوّت کو حاصل کر کے راہِ ولایت شروع کیا کرتے تھے۔ بلاشبہ شریعت، طریقت، حقیقت اور معرفت کا مقصود محبّت الٰہی ہے اور محبّت کے مدارج و اقسام ہیں۔ حُبّ عقلی۔ حُبّ فطری۔ حُبّ ایمانی وغیرہ۔ حُبّ عقلی میں نظر فائدہ پہ رہتی ہے۔ مریض اسی فائدہ و شفا کی خاطر کڑوی اور تلخ دوا کو گوارا کر لیا کرتا ہے۔ حُبّ فطری انسانی اختیار سے باہر ہے اور یہ تقاضائے فطرت پر مبنی ہوتی ہے۔ اب رہی حُبّ ایمانی تو اس کا نام شریعت ہے اور یہ بالکل اختیاری ہے۔ چونکہ یہ اختیاری ہوتی ہے۔ اس لیے اس پہ جزا و سزا

بھی مرتب ہوتی ہے ۔ یہی حُبِّ ایمانی ترقی کر کے حُبِّ عشقی بن جاتی ہے اَشَدُّ حُبًّا لِلّٰہِ کی آیت کریمہ اسی حُبِّ عشقی کی طرف اشارہ کر رہی ہے ۔ حُبِّ ایمانی گویا حُبِّ عشقی کا مقدمہ ہے ۔ اس حبِ عشقی میں نہ اختیار ہوتا ہے اور نہ ارادہ ۔ حُبِّ ایمانی کے گویا اس طرح دو مدارج ہیں یعنی ولایت اولیا اور ولایت انبیاء جن کو بالفاظ دیگر قربِ نوافل اور قربِ فرائض سے بھی موسوم کیا جاتا ہے ۔ ولایت اولیا میں اللہ تعالےٰ کی ذات بحت کی تجلّی صفات کے پردے میں ہوتی ہے ۔ جہاد نفس اس کے لئے لازمی ہے اور تصوّرِ شیخ کی اسی منزل میں ضرورت ہوتی ہے اور اسی کو جہاد اکبر بھی کہا گیا ہے ۔ ولایت انبیاء میں تجلّی کا ظہور بلا واسطہ ہُوا کرتا ہے ۔ اس مرتبہ کا جہاد ، جہادِ اصغر کہلاتا ہے ۔ اس منزل میں فنافی اللہ ہو جانے کی وجہ سے نہ بیعت کی ضرورت رہتی ہے اور نہ تصوّرِ شیخ کی ۔ کیونکہ دونوں کا مقصد حاصل ہو چکا ۔ صاحب ولایت انبیا کا مرتبہ یہ ہوتا ہے کہ اللہ تبارک و تعالےٰ خود اس کا ہاتھ ، کان اور زبان بن جاتا ہے اور گفتۂ اُو گفتۂ اللہ بود ۔ اندریں صورت کون ہے جو پہلے ہی قدم پر بلا واسطہ تجلّی کو برداشت کرے اور اگر کر سکتا ہے تو ایسا شخص فنافی اللہ ہونے کی وجہ سے ہوش و حواس کھو کر مجذوب بن کر رہ جاتا ہے جس کو بظاہر دُنیا سے کوئی تعلّق نہیں ہوتا ۔ اب مجدد نواز جو کچھ فرمائیں اُن کی زبان کوئی نہیں پکڑ سکتا ، مگر عام طور پر ایسا ہوتا نہیں ۔ بلندی سے دیکھنا انبیا کے

لئے مختص ہے پستی سے بلندی کی طرف رُخ کرنا عامی کی خصوصیت ہے۔ صوفیہ کی منزلیں پستی سے بلندی کی طرف جاتی ہیں۔ چنانچہ ترقی کے مدارج یہ ہیں:۔
۱۔ سالک ناقص (۲) سالک مجذوب (۳) مجذوب (۴) مجذوب سالک۔ اور پھر (۵) سالک کامل۔

ایمان لانے کے بعد سالک مخلوق سے حق کی طرف رجوع کرتا ہے اسی کو سلوک ولایت سیر الی اللہ اور مرتبہ جمع اولیا کا مقام کہا جاتا ہے جب کمال حاصل کر کے سالک حق سے خلق کی طرف اس کو تربیت دینے کے لئے بھیجا جاتا ہے تو اسے راہِ نبوت۔ سیر فی اللہ اور جمع الجمع کہتے ہیں لہٰذا نا ممکن ہے کہ ایمان لانے کے بعد بغیر مدارج طے کئے ہوئے کوئی ولایت انبیاءؑ کو حاصل کر سکے۔ اب اگر ولایت اولیا اور ولایت انبیاء کی تعریف یہی ہے جو صراط مستقیم میں لکھی گئی ہے اور جو ہمیں بھی تسلیم ہے مگر تقدم و تاخر کا قصہ جو پیدا کیا گیا ہے۔ وہ ہر اصول ظاہر و باطن کے خلاف ہے۔ اسی کے متعلق کہا گیا ہے کہ ایجاد بندہ اگرچہ گندہ۔ اسی سلسلہ میں یہ بحث بھی کی جاتی ہے کہ ولایت کا درجہ نبوت سے افضل ہے یا نہیں۔ اس استفسار میں ایک مغالطہ ہے۔ یہ عام سوال نہیں ہے بلکہ نبی کی ولایت اور نبی کی نبوت کے متعلق ہے کیونکہ یہ دونوں نبی کے لئے لازمی ہیں نبی کی ولایت کو نبی کی نبوت پر یقیناً فضیلت حاصل ہے۔ اس لئے کہ ولایت نبی کی صفت ہے اور نبوت نبی کا عہدہ ہے، اسی صفت ولایت کی وجہ سے عہدہ نبوت

عطا کیا جاتا ہے۔ کوئی نبی ایسا نہیں ہے جس نے درجہ ولایت طے نہ کیا ہو۔ لہٰذا صفت کو عہدہ پر مرجح خیال کیا گیا ہے۔ اب جہاں تک ولی کا تعلق ہے تو ولایت ولی اور ولایت نبی دونوں مجاہدے اور صفت ہیں۔ ان میں سے کسی کو عہدہ سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا، ولایت نبی میں نبی کے سے اختیار اور حقوق مل جاتے ہیں لیکن ایسے ولی کو نبی نہیں کہا جا سکتا کیونکہ وہ ان حقوق سے نبی کا اتباع کیا کرتا ہے اس کے علاوہ نبی معصوم ہوتا ہے اور ولی محفوظ ہوتا ہے۔ ولی کو معصوم کہنا صحیح نہیں لہٰذا ولی و نبی میں مطابقت و مشابہت کی وجہ سے دونوں کو مساوی و برابر سمجھنا نہ صرف غلط ہے بلکہ گستاخی و بے ادبی ہے۔ ذات احدیت جب تشبیہ کو گوارہ نہیں کر سکتی تو تشبیہ ذاتِ نبوت کے لئے بھی گناہ ہے۔

اب وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ ناممکن ہے کہ سید صاحب کو بیعت کرتے وقت شاہ صاحب اپنے قدیمی طرز و طریقے سے ہٹ گئے ہوں اور ولایت نبی کو مقدم سمجھنے لگے ہوں۔ ان خیالات کا وہ وہم و تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ یہ کہنا بھی صحیح نہیں ہو سکتا کہ وہ تا خود اس تجدید یا تحقیق جدید کے مجوز یا محرک تھے، جب ایسی کوئی صورت نہیں تو شاہ اسمٰعیل کے لئے خیالات کو شاہ صاحب کی تعلیم کی تحریف ہی سمجھا جائے گا۔ سید صاحب کی بیعت قبول کرنے سے کچھ پہلے شاہ اسمٰعیل نے درپردہ اس قسم کی تحریفیں شروع کر دی تھیں اور

اس کی شہادت ان مباحثوں سے مل سکتی ہے جو جامع مسجد کی تقریروں کے متعلق علامہ فضل الحق خیرآبادیؒ وغیرہ سے ہُوا کرتے تھے۔ پھر تقویۃ الایمان بھی اس کی شہادت پیش کر سکتی ہے اور سب سے زیادہ معتبر گواہ صراطِ مستقیم ہے جو بعد میں لکھی گئی تھی شاہ اسمٰعیل کی ذہانت و طباعی سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی نکتہ آفرینیاں بعض لطائف فقہی مسائل میں ممکن ہے کہ قابلِ فخر ہوں مگر انہوں نے غضب کیا کہ طریقت میں بھی اپنی معقولیت کو داخل کر دیا۔ پھر اپنی طبع آزمائی کا تختۂ مشق سید صاحب کو بنایا اور یہی امروشی جو طبع سید صاحب کے لئے بلائے جاں ثابت ہوئی۔ مختصر یہ کہ یہ فرقِ ولایت جو شاہ صاحب کی زبان سے بیعت کے وقت کروایا ہے۔ وہ قطعی اختراع ہے اور بر کلۂ خود باید زد۔ اب یہ سوال بھی کیا جا سکتا ہے کہ شاہ صاحب نے وقتِ بیعت کیا مژدہ سنایا تھا۔ اگر یہ مژدہ منجملہ پیشین گوئی ہے تو خیر ورنہ بنیاد کی کجی ہویدا ہو گئی اور اس کو پیشین گوئی سمجھا جائے تو وہ وجود میں نہیں آئی۔ شاہ عبدالعزیزؒ ولایت اولیا کو موخر بنا دینے کے کبھی بھی روادار نہیں ہو سکتے تھے۔ قربِ نوافل کو محذوف کر کے قرب الفرائض کے میدان میں جست لگانا خلافِ فطرت بھی ہے۔ بغیر معرفت کا کمال حاصل کئے ہوئے کفار یا سلاطینِ جابر سے جہاد صحیح طور پر نہیں کیا جا سکتا۔ غالباً لفظی جھگڑے میں مبتلا ہو کر ان صاحبان نے جہادِ اصغر کو جہادِ اکبر پر مقدم

کر دیا ہے۔ اگر اس طرح یہ لوگ جہادِ اکبر کی تعمیل و تکمیل بعد میں کرنا چاہتے ہیں تو یہ ولایت اولیاء بعد از جنگ کے مصداق ہو گی اور مطلب یہ ہو گا کہ گوشہ گزینی اختیار کر کے ٹھنڈے ٹھنڈے خاموشی سے آغوشِ لحد میں استراحت فرمائیں۔ یہ اسمٰعیلی حضرات برائے نام بھی تشبیہ کو گوارہ نہیں کر سکتے اور تنزیہہ میں انتہائی غلو اختیار کرتے ہیں۔ یہی ان کے نزدیک محبّت الٰہی کا ثبوت ہے۔ صفات کو نظر انداز کر کے محض جامد اسم کو رٹنا خلاف شانِ اسلام ہے۔ صفتوں اور شانوں سے حرکت وحیات کا ظہور ہوتا ہے۔ اسم جامد کو ہی بُت کہا جاتا ہے۔ صفتوں کا مُنہ سے اقرار کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا جب تک ان کی سیر نہ کی جائے اور یہ سیر لامتناہی ہے کیونکہ اسم ذات کی نہ حد ہے نہ نہایت۔ مختصر یہ کہ اس کو دھاندلی ہی کہا جا سکتا ہے کہ شاہ اسمٰعیل کے نئے اصُول کو سیّد صاحب کی زبان سے کہلوایا اور ولایتوں کی جدید ترتیب کی شہادت شاہ عبدالعزیزؒ سے دلوائی۔ ولایتوں کی ترتیب بدل دینے کا عملی تجربہ کیا جائے تو منزل ہی طے نہیں ہوتی۔ راستہ کے ہر مقام پر لکھا ہُوا نظر آتا ہے کہ ایں رہ کہ تو میروی بہ ترکستان است۔ اس میں سالک دلدل میں پھنس کر ہلاک ہو جاتا ہے۔ نئی اور قدیم ترتیب ولایت سے خلط مبحث وجود میں آتا ہے اور یہ ایسی تھی ہے جو سلجھائے نہیں سلجھتی۔ لہٰذا داستان بیعت جو لکھی گئی ہے وہ اسی

طرح قابلِ قبول سمجھی جا سکتی ہے کہ سیّد صاحب کو فنا فی اللہ مجذوب اور بے ہوش تصوّر کر لیا جائے اور ایسے شخص کو نہ بیعت کی ضرورت ہے اور نہ کوئی دانا اس کو مرید کرنے کی جرأت کرے گا۔ برخلاف اس مصنوعی داستان کے واقعہ صرف اتنا ہے کہ شاہ صاحب نے سیّد صاحب کو اپنے اصول کے مطابق مرید کیا، اپنے دستور کے مطابق مجاہدات کروائے اور اپنی صحبت سے مستفیض کیا۔ اس کے بعد حسبِ قاعدہ خلافت عطا فرمائی۔ جدید اصولوں نے سیّد صاحب پر پردہ ڈال دیا ہے ان کی جامعیّت کو تنگ و محدود بنا دیا ہے۔ ان کو پہلے ہی قدم پر صرف ولایت انبیا سے ہی مفتخر نہیں کیا ہے بلکہ امام اور معصوم بھی مشہور کر دیا ہے بلکہ مہدی بھی بنا دیا ہے[لے]۔ وہ جو کچھ بھی بنائیں مگر مادر زاد ولی یا امام کو رسمی علوم کے مباحث سے کوئی لگاؤ نہیں ہوتا۔ اس کا ذریعہ معلومات علمِ معقول سے علیحدہ ہوا کرتا ہے وہ مدرسہ والوں کی خو بو نہیں رکھتا۔ وہ اپنی روحانیت کے سامنے ان واہیات فروعی مباحث کو بے حقیقت سمجھتا ہے اور ان میں اپنا وقت ضائع نہیں کیا کرتا۔ اعتراض سے بچنے کے لئے خواہ مخواہ سیّد صاحب کو ظاہری تعلیم سے مزیّن کرنے کی ناکام کوشش کی گئی ہے اور جب اطمینان نہ ہوا تو عجائب پرستی کی آڑ لے کر شہرت دے دی کہ نعوذ باللہ من ذالک سیّد صاحب کمال متابعت پر ساتھ حضور نبی کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے مخلوق کئے گئے

لے ملاحظہ ہو نواب صدیق حسن کی اربعین۔ ولایت علی صادق پوری کا رسالہ نسخہ اللہ جعفر تھانیسری کی برکات اسلام لہ مقالات سر سیّد حصہ شانزدہم

تھے۔ اسی سبب سے بے علم رہے۔ اسی لئے انہیں اُمّی سمجھا گیا اور علم لدُنّی سے متصف کیا گیا۔ پھر اسی بنیاد پر تجدد پرستوں نے ولایت انبیاء کو نبوت سے ملا کر ان کے مرتبہ کو نبوت کی برابر ظاہر کیا مگر یہ اظہر من الشمس ہے کہ رسول ہاشمی و عربی صلوا علیہ و آلہ کا اُمّی ہونا مخصوص و بے مثال معجزہ ہے جس طرح سوائے ازواج نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی عورت کو اُم المومنین نہیں کہا جا سکتا، اسی طرح کسی مرد کو بھی اُمّی سے موسوم نہیں کیا جا سکتا اور اگر تشبیہ کا ایسا ہی شوق ہے تو ان کو ایسے نورانی و لاثانی وجود کی غلامی سے منسوب کر دینا چاہیئے۔ یہ غلامی ہی معراج ولایت ہے۔ معتقدین نہیں سمجھتے کہ حضرت سید احمد علیہ الرحمتہ سے روز حشر جب ان خطابات و کرامات کے متعلق جواب طلب کیا جائے گا تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرح وہ صاف کہہ دیں گے کہ میں اپنے ان پرستاروں سے بری ہوں۔ ان ہذیانات سے میرا کوئی تعلق نہیں۔

کچھ تو ہوتے ہیں محبت میں جنوں کے انداز
اور کچھ لوگ بھی دیوانہ بنا دیتے ہیں

تیسرا باب

بیعت کے بعد

سید صاحب کا قیام دہلی میں تقریباً ڈیڑھ دو سال رہا۔ اس عرصہ میں مجاہدات کیئے اور شاہ صاحب کی صحبت سے مستفیض ہوئے لیکن مدرسہ والوں میں سے کسی سے خاص شناسائی نہ ہوسکی اور نہ کسی نے انہیں قابلِ توجہ سمجھا اور نہ شاہ اسمٰعیل نے اپنے اس شاگرد کے متعلق کسی حسنِ ظن سے کام لیا۔ اب فراق و جدائی کی منزل تھی۔ لہٰذا ۱۲۲۳ھ / ۱۸۰۸ء میں دہلی کو خیرباد کہا۔ تقریباً اسی زمانہ میں زمان شاہ جب افغانستان پر ایرانیوں کے حملہ کی خبر سن کر لدھیانہ سے کابل گیا ہے تو رنجیت سنگھ کو اپنا گورنر پنجاب بنا کر گیا ہے۔ اسی سال رنجیت سنگھ نے کشمیر، ملتان اور پشاور پر تسلط کر کے پنجاب میں سکھ حکومت کی بنیاد رکھی ہے۔ اسی سال سید صاحب دہلی سے رخصت ہو کر اپنے وطن پہنچے تھے۔ انہیں دیکھ کر اہلِ وطن اور اعزا کو حیرت ہوئی اور سب نے جوش و مسرت سے ان کا استقبال کیا۔ سب سے زیادہ خوشی اس بات کی تھی کہ ان کا لاابالی پن سنجیدگی سے بدل گیا تھا اور وہ مہذب بن گئے تھے۔ وہ نہ صرف خود شریعت کی پابندی کرتے تھے بلکہ اوروں کو بھی باشرع بننے

کی ہدایت کرتے تھے۔ اہل خاندان نے موقع کو غنیمت سمجھا اور ان کے گلے میں سنت پیغمبری کا طوق ڈال دیا، تاکہ ان کی گریز پائی کا علاج ہو جائے اور گھر کی رونق میں اضافہ ہو۔ افسوس ہے کہ ابتدائی حالات کی طرح ازدواجی زندگی کے واقعات نہ لکھے جا سکے۔ یہ معاصرین کی غلطی ہی کہی جا سکتی ہے۔ یہ سب لوگ اپنے آپ کو عجائبات میں کھو بیٹھے۔ اور خواب و خیال کے درپے ہو کر حقیقت سے بیگانہ رہے مثلاً سید صاحب کو رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی زیارت جسمی کا شرف حاصل ہوا۔ نبی کریم صلوٰۃ اللہ علیہ نے خواب میں تین چھوہارے اپنے دست مبارک سے انہیں کھلائے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اپنے ہاتھ سے غسل دیا۔ بی بی فاطمۃ الزہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے کپڑے پہنائے حضرت غوث الثقلین اور خواجہ نقشبند میں اپنی اپنی طرف جذب کرنے کے متعلق ایک مہینہ تک نزاع رہا اور آخرکار فیصلہ یہ ٹھہرا کہ دونوں حضرات ایک ساتھ ان کو ان کو اپنی روحانیت سے مستفیض کر دیں خواجہ بختیار کاکی نے خاص طور پر توجہ فرما کر نسبت چشتیہ سے سرفراز کیا، جبکہ ان کے مزار پر جا کر معتکف ہوئے تھے وغیرہ وغیرہ۔ ان خوابوں کی حقیقت اور اہمیت کچھ ہی ہو مگر یہ نہ سبق آموز ہیں اور نہ قابل سند ان سے ان کے اعزاز و منزلت کا اظہار مقصود ہے مگر دو بزرگوں کی ایک مہینہ تک کشمکش فسانہ معلوم ہوتی ہے۔ ایسی جنگ

مُلک روحانیت میں نہیں ہُوا کرتی۔ بہرحال وطن کے اس قیام میں ان کے سکون کی تہ میں اضطراب کی لہر نمایاں ہے۔ وہ نچلے بیٹھنے والے نہ تھے۔ دو برس کے صبر و سکون سے اُکتا اُٹھے۔ پھر ایک مرتبہ جب بیتابی نے زور کیا تو چل دیئے اور وطن سے ہوا ہو گئے۔

براہ دہلی پہنچے ہوں یا براہِ راست مگر مالوہ پہنچ گئے۔ طریقت کے اصول کے مطابق براہ دہلی جانا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اغلب ہے کہ مرشد کی یاد انہیں دہلی لے گئی ہو وہاں سے مالوہ پہنچنے کے متعدد وجوہات قیاس کئے جاسکتے ہیں یعنی :-

۱۔ اللہ جل شانہٗ نے براہ راست حکم دیا۔ ۲۔ الہام ہُوا۔ ۳۔ مرشد نے ہدایت کی۔ ۴۔ بھائی کے پاس جانے کی تمنا تھی۔ ان کے بھائی امیر خاں کی ملازمت میں تھے یا تو مسجد کے امام تھے یا فوج کا کوئی عہدہ رکھتے تھے ان کا نام کسی نے عبدالرحمٰن لکھا ہے اور کسی نے سید ابراہیم بتایا ہے ان کا انتقال سید صاحب کے پہنچنے پر ہُوا تھا۔ غرض سید صاحب کی موجودگی ۱۲۲۵ھ ۱۸۱۰ء میں امیر خاں کے جتھے میں پائی جاتی ہے۔ امیر خاں کے یہاں کسی کی تنخواہ مقرر نہیں تھی۔ مالِ غنیمت مل جاتا تو عید ہو جاتی ورنہ محرم کا مہینہ رہتا۔ لشکری ابتداءً سید صاحب سے واقف نہ تھے مگر ان کے بے تکلفانہ انداز میں کشش تھی، ان کے عادات کو دیکھ کر وہ متحیر بھی تھے اور خوش بھی۔ خوش اس لئے تھے کہ کسی کی خدمت کرنے میں انہیں عار نہیں تھا اور حیرت یوں تھی کہ دُور جنگل میں جا کر ریاضت و عبادت

کیا کرتے تھے جب کسی کے ساتھ کسی مہم پر جانے تو فتح ہوتی تھی۔ لہٰذا سب سمجھتے تھے کہ ان کی موجودگی سے خوشحالی و آسودگی پیدا ہو گئی ہے۔ اس قسم کا بھی خیال کیا گیا تھا کہ یا تو وہ بہت بڑے عامل ہیں یا انہیں کیمیا آتی تھی لیکن ان قیاسات کی سیّد صاحب تردید کر دیا کرتے تھے۔ غرض ان کے حالات کو دیکھ کر لشکر میں مختلف چرچے ہونے لگے اور معمولی لشکری سے لے کر امیر خاں تک کو ان سے دلچسپی ہو گئی۔ سیّد صاحب اکثر اپنی ترنگ میں امیر خاں کی تخلیہ کی مجلس میں پہنچ جاتے تھے اور جملۂ معترضہ کے طور پر بے ربط کچھ ایسی بات کہہ دیا کرتے تھے جو ان کے مفید مطلب ہو جاتی تھی۔ یہ بھی سُنا ہے کہ ایک مرتبہ حالت جنگ میں غنیم انگریز کے خیمہ میں بھی بے درنگ چلے گئے تھے اور وہ انگریز ان کی باتوں سے محظوظ ہُوا تھا۔ یہ سمجھنا کہ امیر خاں نے انہیں اپنا مشیر بنا لیا تھا، محض ہوائی ہے۔ عام طور پر سب کے سب اپنے مستقبل کے متعلق ان سے دریافت کیا کرتے تھے لشکری اس قسم کی باتوں نجوم و فال کے قائل ہُوا کرتے ہیں۔ وہ سب فرصت کے اوقات میں ان کے متعلق گفتگو کیا کرتے تھے کہ آخر یہ ہیں کیا۔ عامل و کیمیاگر اگر نہیں ہیں تو انہیں عالم سمجھنا چاہیئے مگر ان کے بھائی سے معلوم ہو گیا تھا کہ وہ پڑھے لکھے نہیں ہیں۔ پھر یہ کہا جاتا تھا کہ انہیں علم غیب کیسے حاصل ہے۔ کوئی کہتا کہ جن یا ہمزاد ان کے قبضہ میں ہے۔ کوئی سمجھتا کہ دل آتا ہے۔ ایک دہلی والے سپاہی نے کہا

یہ سب خیالات و قیاسات شرک و بدعت ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ شاہ عبدالعزیزؒ نے ان پہ نظر ڈال دی ہے۔ انہیں کے مونڈے ہوئے ہیں۔ وہ جاہلوں کو دانا و بینا بنا دیا کرتے ہیں۔ غرض طرح طرح کی سید صاحب کے متعلق چہ میگوئیاں ہوا کرتی تھیں اور معمہ حل نہیں ہوتا تھا۔ ہونے والی بات انگریزوں نے نیپال والوں سے فارغ ہو کر بہت بڑی فوج سے یکدم مالوہ کے راجپوتوں کا محاصرہ کر لیا اور اسی موقع و سلسلے میں امیر خاں کی انگریزوں سے صلح ہو گئی جس کے بعد امیر خاں کو ریاست ٹونک ملی اور نوابی کا خطاب ملا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ یہ صلح سید صاحب کی جلت پھرت اور برکت سے ہوئی اور بعضوں کا قیاس ہے کہ یہ صلح سید صاحب کی مرضی کے خلاف ہوئی مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ اس صلح سے سید صاحب کو کیوں منسلک کیا جاتا ہے۔ دنیوی و سیاسی لحاظ سے سید صاحب کو کوئی اہمیت نہ تھی اور صلح کے معاملہ میں ان کا دخل ہی کیا ہو سکتا تھا۔ اب یہ کہ فقیر و ولی ہونے کی وجہ سے دعا کر دی، تو صحیح ہے لیکن یہ کہنا کہ صلح سید صاحب کی مرضی کے خلاف ہوئی، قطعی فضول ہے آخر انہیں اس سے مطلب کیا تھا اور پھر لطف یہ ہے کہ دونوں فریق اپنا اپنا ثبوت "وقائع احمدی" سے ہی پیش کرتے ہیں۔ ایک فریق کا کہنا ہے کہ سید صاحب نے سمجھایا کہ صلح نہ کرو مگر نواب کا عذر یہ تھا کہ لشکر کا سامان درست نہیں ہے۔ لشکر والوں میں اتحاد نہیں رہا ہے۔ لہٰذا مصلحت یہی

ہے کہ دس پانچ لاکھ روپیہ اس طرح انگریزوں سے لے کر سامان درست کر لیا جائے، اس کے بعد پھر انگریزوں سے لڑا جائے۔ سید صاحب نے جواب دیا کہ مصالحت کے بعد آپ سے کچھ نہ ہو سکے گا۔ (وقائع)

اسی دوران میں شہرت ہوئی کہ میجر آکٹرلونی نواب سے ملنے آ رہے ہیں تو سید صاحب آدھی رات سے ہی لشکر میں پہنچ گئے۔ پھر بعد نمازِ فجر سید صاحب کا ہاتھ پکڑ کر باتیں کرتے ہوئے نواب مسجد سے باہر نکلے۔ سید صاحب نے آخری مرتبہ پھر سمجھانے کی کوشش کی کہ صلح مناسب نہیں ہے مگر نواب نے پھر وہی جواب دیا کہ اس وقت ملنا ہی مناسب ہے۔ میں انگریز سے عہد برآ نہیں ہو سکوں گا (وقائع) اس بیان سے صاف ظاہر ہے کہ یہ گفتگو ایسی ہی ہوئی جیسے کسی غیر متعلق شخص سے ہوا کرتی ہے اور جواب بھی ایسا ہی دیا گیا جیسا کہ کسی دخل در معقولات کرنے والے کو دیا جاتا ہے۔ اگر امیر خاں پہ سید صاحب کی تعلیم کا کچھ بھی اثر ہوتا تو امیر خاں کی زبان سے ایسی کیادی کی بات کبھی نہیں نکلتی کہ انگریزوں سے روپیہ حاصل کر کے انگریزوں ہی سے لڑوں گا۔

بدوزد طمع دیدۂ ہوشمند، دوسری طرف وزیر الدولہ کا یہ قول ثبوت میں پیش کیا جاتا ہے کہ سید صاحب جس روز لشکر میں آئے ہیں، اسی روز سب سے پہلے اعلان فرمایا تھا کہ امیر خاں کو ریاست ملیگی تو ابھی ملے گی اور پھر کچھ عرصہ کے بعد مجاہدین کا لشکر لے کر اس ریاست سے ہم

گذریں گے۔ کہا جاتا ہے کہ جب ایسی پیشین گوئی کر دی تھی تو گویا اس صلح کے بانی بھی وہی تھے ورنہ یہ سب کچھ وجود میں نہ آتا۔ اس تمام داستان کو سُن کر بعض ضعیف العقیدہ اصحاب نے یہ رائے قائم کی ہے کہ سید صاحب کے دماغ میں پیدائش کے دن سے جہاد کا تصور و نقشہ موجود تھا اور ہر زندگی میں اپنے اسی خیال کے پورا کرنے کی کوشش میں منہمک رہے۔ یہ سب واہمہ کی ستم ظریفیاں ہیں۔ یہ دونوں روائتیں صلح کرانے یا نہ کرانے کی بھنگڑ خانہ کی گپیں معلوم ہوتی ہیں۔ ملفوظات شاہ عبد العزیز کی روایت وقائع احمدی کی روائتوں سے زیادہ وقیع معلوم ہوتی ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ ایک شاہی عہدہ دار شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہُوئے اور اپنی بپتا مفلسی و بے بسی کی سُنا کر طالب دُعا ہُوئے۔ حضرت نے فرمایا۔ قرآن شریف میں فال دیکھو۔ فال نکالی گئی تو اس کا مطلب یہ بتایا کہ جانب جنوب تمہیں سفر کرنا ہے۔ چودھویں منزل پر مسلمانوں کی بستی آئے گی۔ وہاں کی مسجد میں تمہارا قیام ہوگا۔ ممکن ہے کہ تمہیں چند فاقے بھی وہاں کرنا پڑیں مگر گھبرانا نہیں۔ پھر اللہ کے فضل سے خود بخود بہتری کی صورت پیدا ہو جائے گی۔ غرض ہوبہو ایسا ہی ہوا۔ ٹونک کی مسجد میں جا کر قیام کیا۔ مسجد میں امیر خاں سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے ان سے خوش اخلاقی کا برتاؤ کیا دوران کے تمام حالات پوچھے اور بہت دیر تک گفتگو رہی مہمان

کی تواضع کرنا امیر خاں کی عادت میں داخل تھا مگر افکار میں مبتلا ہونے کی وجہ سے اس مہمان کے کھانے کا انتظام کرنا بھول گئے۔ لہٰذا ایک دو فاقوں کی نوبت آگئی، جب اپنی محفل میں نواب نے اپنے مشیروں سے انگریزوں سے صلح کرنے کے متعلق مشورہ کیا۔ تو ان میں اس کے متعلق اختلاف رائے تھا۔ اسی موقع پر انہیں دہلی والے مسافر کا خیال آیا۔ لہٰذا طلب کر کے ان سے بھی معاملہ معلومہ میں استفسار کیا۔ انہوں نے مشورہ دیا کہ الصلح خیر، بس فیصلہ ہو گیا۔ پھر ان ہی صاحب کو اپنا سفیر بنا کر میجر اکٹرلونی کی خدمت میں دہلی بھیجا گیا۔ سفارت کے تمام لوازمات فراہم کر دیئے گئے اور پانسو روپیہ ماہوار کا وظیفہ مقرر کیا۔ دہلی پہنچ کر یہ صاحب سیدھے شاہ صاحب کی خدمت میں گئے اور کہا کہ آپ کی دعا سے میرے دن پھر گئے۔ فرمایا کہ یہ قرآنی فال کی برکت ہے۔ بہرحال جب قرآنی فال کے مطابق اس طرح انگریزوں سے صلح ہو گئی تو سید صاحب کو بھی ہرگز ناگوار نہیں ہونا چاہیئے تھی مدعا یہ ہے کہ اس صلح میں کسی نوعیت سے سید صاحب کا ہاتھ نہیں تھا۔ تذکرہ نویسوں کی یاوہ گوئی کا نہ انشا درست ہے اور نہ املا، صحیح ہے۔ تاریخ اس صلح کے متعلق واضح بیان رکھتی ہے کہ لارڈ ہسٹنگز نے مالوہ میں اپنے مخالفوں کے گرد گھیرا ڈال دیا تھا۔ امیر خاں کے حلیف یکے بعد دیگرے انگریزوں کی اطاعت قبول کر کے ان سے معاہدے کر رہے تھے۔ ایسی حالت میں امیر خاں کے سامنے یا صلح تھی یا موت اس

مصیبت کا علاج سید صاحب کی ولایت سے جب کچھ نہ ہو سکا تو آخر امیر خان کب کرتا بے شک وہ بغیر صلح کئے ہوئے عہدہ بر آ نہیں ہو سکتا تھا اور خصوصاً اس وقت جبکہ اس کے لشکر میں ابتری بھی پڑ گئی ہو۔ لہٰذا ان حالات کون سر پھرا کہہ سکتا ہے کہ صلح نہ کی جائے جو اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ سید صاحب صلح کے مخالف تھے۔ وہ دماغ ضرور رکھتے ہیں مگر بھیجہ نہیں رکھتے۔ بے مغز کا دماغ اسی قسم کی بات کہہ سکتا ہے۔ یہ واقعہ کہ بعد نماز فجر سید صاحب باتیں کرتے ہوئے نواب کے ساتھ مسجد سے باہر نکلے۔ صاف بتا رہا ہے کہ نواب نے اس طرح انہیں خدا حافظ کہا۔ یہ ملاقات الوداعی تھی جس کے بعد سید صاحب دہلی کو روانہ ہو گئے۔ سید صاحب نے جو خط شاہ صاحب کو لکھا تھا۔ اس کا مضمون یہ تھا کہ:۔ "یہ خاکسار سراپا انکسار حضرت کی قدمبوسی کے لئے عنقریب حاضر ہوتا ہے۔ یہاں لشکر کا کارخانہ درہم برہم ہو گیا۔ نواب فرنگی سے مل گئے۔ اب یہاں رہنے کی کوئی صورت نہیں۔ (وقائع) اس کا وہ مطلب نہیں جو لیا گیا بلکہ یہ ہے کہ لشکر میں ابتری پڑ گئی۔ نواب اور فرنگی میں صلح ہو گئی۔ آئندہ خدا جانے کیا انتظام ہو۔ اس لئے میری رائے یہی ہے کہ خدمت اقدس میں حاضر ہو جاؤں۔ یہ سمجھنا بعید از قیاس ہے کہ فرنگی سے صلح کر لینا مجھے ناگوار ہے اور اب میں جہاد کی تیاری کرنے کے لئے آپ کے پاس آ رہا ہوں۔ اس خط سے ترشح ہوتا ہے کہ شاہ صاحب کے اشارے سے وہ یہاں آئے تھے اور اب واپس آنے کی اجازت

غور طلب یہ امر ہے کہ اس سات برس کے عرصہ میں سید صاحب اور شاہ صاحب کے درمیان کوئی ربط و ضبط رہا یا نہیں۔ مرزا حیرت تنہا راوی ہیں کہ سید صاحب مدرسہ دہلی کے لئے لشکر سے چندہ جمع کرکے بھیجا کرتے تھے۔ اگر یہ روایت صحیح ہے تو ربط یقیناً مسلسل رہا۔ مزید برآں یہ خط خود ربط و تعلق کا ثبوت ہے۔ صاحب "سیرت سید احمد شہید" نے قیام مالوہ کے متعلق ہر خرافات سے بچ کر کمالات کا اظہار مختصر اور مبہم طور پر کیا ہے۔ ارخ احمدی میں کرامات کی بھرمار ہے

مولانا غلام رسول مہر صاحب نے اپنے عالمانہ افکار کو کمال و بسط سے پیش کیا ہے۔ تاویلات سے کام لے کر اعتراضوں اور خامیوں کو نباہ دیا ہے اور اِدھر اُدھر کے واقعات سے ثبوت بہم پہنچا کر کرامتوں کو قابلِ قبول بنا دیا ہے۔ اس طرح انہوں نے اپنی خیالی تصویر میں رنگ بھرے ہیں مگر عجائب پرستی پھر بھی نہ چھپ سکی۔ کرامتیں جو منسوب کی گئی ہیں۔ ان میں آورد نمایاں ہے۔ واقعات جو پیش کئے گئے ہیں ان کی روداد تاریخ نہیں ہو سکتی۔ واقعہ یہ ہے کہ سید صاحب کا درجہ و مرتبہ ان فرضی رنگ آمیزیوں سے بہت بلند و بالا ہے جس تک ان صاحبان کی رسائی نہ ہو سکی۔ لہٰذا چوں ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند حیرت ہے کہ اس عرصہ میں سید صاحب کو اپنی اہلیہ و وطن کی کبھی یاد نہیں آئی۔ جملہ تذکرے ان امور کے متعلق صامت و ساکت ہیں، تاویلات بھی اس خلا کو پورا نہ کر سکیں۔

کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

چوتھا باب

تبلیغی دورے

یہ تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ بیعت کے بعد چھ دن کے اندر سیّد صاحب کو شاہ صاحب نے دولتِ رُوحانیت سے مالا مال کر دیا تھا اور خزانے کی کنجیاں بھی مرحمت فرما دی تھیں۔ لیکن کچھ عرصہ وہ سرشار اور بے ہوش سے رہے۔ دولت کا نشہ اگر ایک طرف غضب کا ہوتا ہے تو دوسری طرف اس کا استعمال بھی دشوار ہوتا ہے۔ دولت کی مستی، دولت کی بربادی کا بھی باعث بن جایا کرتی ہے اور اس کی حفاظت کنجوس بھی بنا دیا کرتی ہے۔ اپنے جُدا کرنے سے یہ دیکھنا منظور تھا کہ وہ اس دولت کا مصرف کس طرح کرتے ہیں۔ داستانیں جو سُنائی گئی ہیں اور روائتیں جو درج کی گئی ہیں، ان سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ انہوں نے دولت کو دونوں ہاتھوں سے خوب لٹایا، لیکن سیّد صاحب کی رُوحانی ترقیاں برابر اعلان کرتی ہیں کہ انہوں نے اسراف بالکل نہیں کیا۔ اب اگر عقیدت مندوں نے بے پَر کی اُڑائی ہے تو سیّد صاحب کو اس سے کوئی تعلّق نہیں۔ البتہ یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ انہوں نے ان کو بے سرو پا افواہوں کے مشہور کرنے سے کیوں باز نہیں رکھا۔ انہیں یقین تھا کہ جب ان میں تمیز آ جائے گی تو وہ خود یا وہ گوئی سے باز آ جائیں گے۔ اس لئے ان کو ضرورت نہ تھی کہ اصل مقصد کو

چھوڑ کر ان فضولیات پر توجہ کرتے۔ بہر حال سید صاحب کو کمال حاصل کرنے میں آٹھ نو برس لگے۔ ظاہری اسباب کچھ ہی ہوں مگر یہ شاہ صاحب ہی کی کشش تھی کہ سید صاحب کو ٹونک چھوڑنا پڑا۔ یہ خط جو انہوں نے لکھا تھا در اصل شاہ صاحب کی ہی توجہ باطن کی رسید تھا۔ لطائف کے کھل جانے پر وحشت و اضطراب سے سابقہ پڑا کرتا ہے۔ مزاجی کیفیت بدل جاتی ہے۔ ہر لطیفہ اپنی خاص تاثیر رکھتا ہے۔ لطائف کی ان مخلوط تاثیروں کی کشمکش بلائے جان بن جاتی ہے۔ یہی کشمکش قلب کی روشنی کا باعث ہوا کرتی ہے۔ اس کے ہی جلووں کی وجہ سے کرامتیں اور پیشین گوئیاں خود بخود صادر ہونے لگتی ہیں مگر وحشت و بیزاری کی وجہ سے وہ قابلِ اعتماد نہیں ہوتیں۔ یہ سب عارضی ہوتی ہیں لیکن جب مستقل ہو جاتی ہیں تو یہ دولت بہت احتیاط سے صرف کی جاتی ہے۔ سہار اور برداشت ہو جانے پر سکون و تحمل کا شعور ہوا کرتا ہے۔ سید صاحب اس مرتبہ دہلی آئے تو ان کے لطائف میں مساوات کا مرحلہ درپیش تھا اور یہ بہت کڑی منزل ہے۔ یہاں شیطان و نفس پوری قوت کے ساتھ حملہ کیا کرتے ہیں۔ شاہ صاحب چاہتے تھے کہ اپنے پاس رکھ کر اپنی نگرانی میں اس مرحلہ کو طے کر کے ولایت اولیا کی سند دیدیں۔ شاہ صاحب کے نقطہ نظر سے اس سلوک کی تائید ہوتی ہے جس کو ظاہر میں نہ سمجھ پائے۔

لکھا گیا ہے کہ سید صاحب نے جب خط بھیجا ہے تو اسی زمانہ

ہیں شاہ صاحب نے خواب دیکھا تھا کہ انہیں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کا شرف حاصل ہُوا تھا۔ تفصیل یہ ہے کہ جامع مسجد دہلی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما ہیں۔ باہر مجمع کثیر مشتاقِ زیارت ہے۔ سب سے پہلے شاہ صاحب کو سعادت باریابی حاصل ہوئی۔ عصائے مبارک مرحمت فرما کر حکم دیا کہ دروازے پر بیٹھو اور بغیر ہم سے اجازت لئے ہوئے آنے والوں کو اندر نہ آنے دو۔" شاہ صاحب فنِ تعبیر کے خود ماہر تھے مگر احتیاطاً شاہ غلام علی نقشبندیؒ سے اس خواب کی تعبیر دریافت کی۔ انہوں نے کہا کہ آپ کے سلسلہ کی اشاعت یا آپ سے خود ہوگی یا کسی مرید رشید سے ہوگی۔ لہٰذا یہ خواب مژدہ سمجھا گیا کہ سید صاحب کے دہلی آنے پر شاہ صاحب کا سلسلہ ان ہی سے چلے گا۔ سید صاحب اس خواب کے ایک ہفتہ کے بعد ٹونک کے لشکر سے ۱۸۱۸ء کے اواخر یا ۱۸۱۸ء کے اوائل میں دہلی آگئے۔

خطائے بزرگاں گرفتن خطا است مگر اس خواب کے معنی ایک عامی بھی سمجھ سکتا ہے۔ خدا جانے شاہ غلام علیؒ نے نئے قسم کی تعبیر کیسے دیدی۔ خواب میں عصا شاہ صاحب کو عطا کیا گیا ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ سلسلہ کی اشاعت ان کے ہی دم سے ہوگی۔ کسی رشید مرید کی شرکت کا خواب میں کوئی ذکر نہیں ہے۔ اگلے فقرے کا مفہوم یہ کیا جاسکتا ہے کہ آئندہ جو مرید کرنا تو ہم سے اجازت لے کر کرنا۔ شاید اس لحاظ سے در پردہ تا مرید خاص سے سلسلہ چلنے کا

اشارہ پایا گیا ہے۔ لیکن سلسلہ مرید سے نہیں بلکہ خلیفہ سے چلا کرتا ہے اور سید صاحب اس خواب سے بہت پہلے مرید ہو چکے تھے۔ بہر حال شاہ صاحب نے کچھ دن بعد منزل طے کروا کے سید صاحب کو اپنی خلافت مرحمت فرما دی اور بیعت کرنے کی بھی اجازت دے دی۔ اس سے پہلے جن صاحبان نے لکھا ہے کہ سید صاحب بیعت لیا کرتے تھے۔ وہ قدیمی اصول کے مطابق تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ بغیر حصول خلافت کے کسی کو مرید کرنے کا حق نہیں ملتا۔ البتہ تبلیغ عام عالموں کی طرح مرید بھی کر سکتا ہے۔ ممکن ہے کہ بیعت و خلافت سے پہلے سید صاحب میں فطری طور پر روحانیت کارفرما ہو مگر پھر بھی مرید کرنے کا حق انہیں حاصل نہیں ہوتا۔ خلافت دینے کے بعد شاہ صاحب نے نہ صرف بیعت کی اجازت دی بلکہ ہمت افزائی کرنے کے لئے اپنے شاگردوں اور اقارب کو خود بھی ان کا مرید کروا دیا۔ اس کے بعد صحیح طور پر نہیں بتایا جا سکتا کہ تبلیغ دین کے لئے مختلف مقامات پر دورے کرنے کا خیال ان صاحبان کا ذاتی تھا یا اس کی بھی شاہ صاحب نے ہی ہدایت فرمائی تھی لیکن شواہد موجود ہیں کہ اس قسم کا مشورہ شاہ صاحب نے ہی دیا تھا۔ جب مولانا عبدالحئی اور شاہ اسمٰعیل نے سید صاحب سے بیعت کر لی تو شاہ صاحب کو اُمید بندھی کہ ظاہری و باطنی علوم کے اتحاد سے جہاد کی اسکیم پایۂ تکمیل کو پہنچ سکے گی اور ساتھ ہی شاہ اسمٰعیل کے نئے خیالات کی بھی اصلاح ہو جائے گی۔ سید صاحب کی روحانیت کو انہیں جیسے عالم و فاضل دبیروں کی ضرورت تھی اور اتحاد

دونوں حضرات کا علم وفضل سید صاحب کی روحانیت کا محتاج تھا۔ علوم ظاہری کے ان ستاروں کا روحانیت کے نیرِّ درخشاں سے رشتہ مل جانے پر یقین تھا کہ بجلی کے منفی ومثبت تاروں کی طرح اتحاد نمودار ہوگا پہلے ہی قدم پر اتنی روشنی پھیلی کہ شاہ صاحب کے حلقۂ اثر میں دلّی سے لے کر پٹنہ و کلکتہ تک کے زمین و آسمان چمک اٹھے۔ مخزنِ برق شاہ عبدالعزیز تھے۔ اُمید قوی تھی کہ اگر اس اتحاد ثلاثہ میں صحیح توازن باقی رہا تو ولی اللّٰہی تحریک جہاد اتمام کو پہنچ سکے گی۔ اسی مفہوم کو شاہ عبدالعزیزؒ نے اس طرح ظاہر کیا ہے کہ عسکری امور میں جب یہ تینوں ہم خیال ہوں تو ان کی رائے کو میری رائے سمجھنا۔ جہاد کی ابھی تک کوئی عملی کوشش نہ ہو سکی تھی کیونکہ اس زمانہ میں مسلمانوں پر جمود طاری تھا، ابتری میں مبتلا تھے اور راہِ حق سے دُور تھے۔ شاہ عبدالعزیزؒ اور دوسرے اکابر اصلاح و تنظیم کی کوشش کر رہے تھے مگر جہاد کے لئے میدان تیار نہ ہو سکا تھا۔ اس کو کامیاب بنانے لئے صحیح دماغ اور صحیح قلب کی ضرورت تھی اور ایسے بے نفس افراد کا فقدان تھا۔ انہیں تخیلات کی بنا پر شاہ محمد یعقوب نے جو شاہ صاحب کے نواسے تھے لکھا ہے کہ سید صاحب کی توجہ شاہ صاحب کی توجہ سے زیادہ زوردار اور پُرتاثیر تھی۔ ممکن ہے کہ ہمگر "بسیار سفر باید تا پختہ شود خامے"

اس کے علاوہ یہ بھی دیکھنے کی ضرورت تھی کہ ظاہری علم روحانیت کا مطیع بنتا ہے یا روحانیت ظاہری علم سے زیر ہو جاتی ہے۔

سید صاحب کا اسمِ گرامی شاہ صاحب کے خلفاء میں سرِ فہرست ہے

اور حضرت مولانا فضل الرحمٰن گنج مراد آبادیؒ کو بھی فضیلت حاصل ہے لیکن سید صاحب کے معتقدین بھول کر بھی سید صاحب کی خلافت اور حصول خلافت کا ذکر نہیں کرتے اور وہ بغیر حصول خلافت کے سید صاحب کی سیادت کے مدعی ہیں۔ دعویٰ یہ ہے کہ سید صاحب کو پیدائشی طور پر ولایت انبیا حاصل تھی۔ اس لئے ان کو نہ کسی راہبر کی ضرورت تھی اور نہ کسی خلافت کی۔ یہی نہیں بلکہ دبی زبان سے ان کے مہدیٔ زماں اور مسیح موعود ہونے تک کا اعلان کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں اور مرتبہ درجہ امام تو سمجھتے ہی ہیں۔ حضرت سید احمد سرہندی علیہ الرحمۃ کو امام ربانی اور مجدد الف ثانی کہا جاتا ہے۔ وہ بھی جبلی طور پر روحانیت کے حامل تھے مگر انہیں حضرت باقی باللہؒ کی بیعت و خلافت کا اقرار ہے اور اس پر فخر بھی کرتے ہیں، جیسا کہ ان کے مکتوبات سے ظاہر و ثابت ہے۔ غالباً سید صاحب کے یہ فدائی ابن تیمیہ کے اتباع میں بغیر حصول خلافت کے انہیں عزت و عظمت سے مزین کرنا چاہتے ہیں۔ اسی وجہ سے سید صاحب کے مختار ہونے کا ادعا ہے اور عدم وجوب تقلید کے قائل ہیں۔ لیکن بایں ہمہ خواہ فرضی طور پر ہی ہو ان کے بیعت ہونے کا اقرار ہے۔ بیعت ہو جانے والے کے متعلق مختاری کا دعویٰ صحیح نہیں مانا جا سکتا۔ اس حقیقت سے گریز ایک قسم کی صریح بغاوت ہے، اسے منافقت بھی کہا جا سکتا ہے اور ذہنیت معکوس بھی خیال کیا جا سکتا ہے۔ یہ

نیچے درون اور نیچے بیرون والا معاملہ کسی معیار پر پورا نہیں اترتا۔ عربی گھوڑا لاکھ اصیل و ذہین ہو اور قدرت کی طرف سے خاص عطیات بھی اسے ملے ہوں مگر اسے بھی کاڑھنے کی ضرورت پڑا کرتی ہے لیکن اس قسم کی تربیت کے بعد بھی اس میں چوگان بازی اور پولو کھیلنے کی اہلیت و قابلیت نہیں ہوتی۔ لہٰذا اسے مزید تعلیم و تربیت دی جاتی ہے۔ یہ خلافت کے منکر غالباً مگر ور حافظہ رکھتے ہیں۔ ان کے بیان سے خود خلافت ثابت ہو جاتی ہے جب شاہ اسمٰعیل سید صاحب کے مرید ہو گئے تو شاہ عبدالعزیزؒ نے ان سے سید صاحب کے کمالات کے متعلق دریافت کیا۔ ان کا جواب سوانح احمدی کے صفحہ بیس اور مولانا مہر صاحب کی کتاب سید احمد شہید کے صفحہ ایک سو اٹھارہ پر محفوظ ہے کہ "سید صاحب پر پروردگار عالم کی نظر کرم ہے اور یہ سب آپ ہی کی توجہ کا نتیجہ ہے۔ اللہ تعالےٰ نے آپ کو دو علم مرحمت فرمائے ہیں۔ علم ظاہری سے شاہ عبدالقادرؒ فیضیاب ہوئے اور علم باطنی کے حامل سید صاحب ٹھیرے"۔ یہ علم باطنی خلیفہ ہی کو دیا جاتا ہے اب رہا دعویٰ مہدیت تو اس پر امتداد زمانہ نے پردہ ڈال دیا ہے اور دعویٰ عیسویت بھی آج ڈیڑھ سو برس کے بعد حرف غلط کی طرح غائب ہو گیا ہے۔ امامت کے متعلق یہ ہے کہ اس کا ضعف ناکامیوں سے ظاہر ہے لیکن باوجود ان مشاہدات کے ان کے پرستاروں کی آنکھ نہیں کھلتی کہ ان کی اصلی عظمت کو سمجھیں۔ اسے کہتے ہیں اندھی تقلید۔ قدرت الٰہی کی

عجیب مثال ہے کہ تقلید کے منکر اندھی تقلید کے قائل ہیں۔

ملفوظات عزیزی میں سید صاحب کا پانچ جگہ ذکر ہے۔ اس سے بہتر سید صاحب سے متعلق مستند رائے اور کہیں نہیں مل سکتی اور اس سے ان کی عظمت ظاہر ہو جاتی ہے۔

۱۔ حضرت شاہ صاحب سید صاحب کے حق میں فرمایا کرتے تھے کہ خاندان مجددی میں نسبت آدمی بسوئے خدا کے نام سے جو نسبت ہے[1] وہ ان کو کرامت ہوئی ہے۔ دہلی میں بہت سے آدمی ان سے منتفع ہوتے تھے۔

۲۔ سید صاحب نے ایک مرید کے متعلق عرض کیا کہ فنائیت اور عشق کی وجہ سے اس مرید کو حضرت سے جو خصوصیت ہے مجھ کو بھی اس سے نہایت درجہ محبت ہو گئی ہے۔ فرمایا، اس کو بندے سے خاص محبت ہے۔ خدا جزائے خیر دے۔ یہ امر اختیاری نہیں ہے جیسا کہ کہا گیا ہے۔

یا دل بہ کہ باید داد یا دل زکہ باید برد
دل دادن و دل بردن۔ ایں امر خداداد است

۳۔ فرمایا سید احمد بریلوی ذکی القلب ہیں (ذکی اسے کہتے ہیں جو اعتبار ثلثہ یعنی طبیعت عقل و قلب کے ذریعہ حرف کہنے سے کل حقیقت سمجھ لے اور تشریح و تفصیل کا محتاج نہ ہو)

۴۔ سید صاحب نے سوال کیا کہ جاڑے کے دنوں میں کنوئیں کا

---

[1] اس میں یا تحریف ہے یا کاتب کا سہو۔ نسبت آدمی بسوئے خدا مشکوک و غلط ہے۔

پانی کیوں گرم ہوتا ہے۔ (علمی توجیہہ کر کے مطمئن کر دیا گیا)
۵۔ سید احمد بریلوی سے فرمایا۔ دنیا بکھیڑے کی جگہ ہے اگر خالص اللہ کے لئے اس سے کچھ حصّہ مل جائے تو بہتر ہے۔
۶۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ شاہ عبدالعزیزؒ نے اپنی جماعت کو حکم دیا تھا کہ عسکری امُور کے جس معاملہ میں سید احمد، مولانا عبدالحی اور شاہ اسمٰعیل تینوں جمع ہو جائیں، اسے عبدالعزیز کا حکم سمجھنا اور تنظیمی امُور کے لئے محمد اسحٰق کو امیر اور مولانا محمد یعقوب کو ان کا مشیر بنایا تھا۔ (مولوی عبید اللہ سندھی)
قصّہ مختصر سوائے جناب مہر صاحب کے ہر تذکرہ نویس کو اقرار ہے کہ شاہ صاحب نے ہدایت فرمائی تھی کہ "بطور خود آس پاس کے شہروں کا دورہ کریں"۔ چنانچہ اسی ہدایت کے مطابق دورہ کیا گیا تھا صاحب سیرت سید احمد شہید سے زیادہ اور کون معتبر ہو سکتا ہے مگر مہر صاحب کو اختلاف ہے۔ بہرحال مذکور ہے کہ شاہ صاحب کی ہی بتائی ہوئی تدبیر کے مطابق مختلف مقامات پر اعلان و اشتہار کے لئے اور چندہ جمع کرنے کے واسطے سفیر بھیجے گئے تھے۔ اس کے بعد مختلف جگہوں سے دعوت نامے آئے تو شاہ صاحب نے ہر جگہ تعارف کے خط لکھے کہ "یہ ہمارے ہی آدمی ہیں"۔ (سوانح احمدی وحیات طیبہ) ان خطوط کے اثرات اور نتائج کا حال یوں کہ جناب مہر صاحب رقمطراز ہیں کہ دل فروز نتائج و ثمرات صرف سفارشوں کے

پیدا نہیں ہوتے بلکہ یہ شگفتگی اور سلامتیت کا جذبہ سید صاحب ہی کی برکات کا کرشمہ تھا۔ بے شک سفارش لائق کی کی جاتی ہے نہ کہ نالائق کی اور جس کی سفارش کی جاتی ہے وہ اپنے آپ کو سفارش کے اہل ہونے کا ثبوت دیا کرتا ہے۔ بغیر سفارش کے اہلیت کا اثر دیر میں ہوا کرتا ہے اور مختلف ہوتا ہے۔ سفارش جب تصدیق اہلیت کر دیتی ہے تو ہر مرحلہ آسان ہو جاتا ہے لیکن اس قسم کی بھی شہادتیں موجود ہیں کہ سید صاحب کی مخالفتیں بھی کی گئی تھیں ان مخالفتوں کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ چشمۂ آفتاب را چہ گناہ۔ مگر مخالفتوں سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور خدا جانے یہ حضرات مخالفتوں کی تشریح سے پہلو کیوں بچاتے ہیں۔ شاید غلط عقیدت مندی میں اتنی ہمت نہیں ہوتی کہ تاریک پہلو کو اجاگر کر کے دکھائے۔ کچھ ہو مگر اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ خاندان ولی اللٰہی کی نسبت اور شاہ عبدالعزیزؒ کی تعلیم اور ہر دلعزیزی ہی بھی سید صاحب اور شاہ اسمٰعیل کی شہرت کا سنگِ بنیاد بنی ورنہ کہا جا سکتا ہے۔ بیلے بود در سیستان۔

ابھی دوآبہ کے دورہ کی تیاری ہو رہی تھی کہ سید صاحب کی بازیافتگی کی خبر سن کر، ان کے بڑے بھائی سید محمد اسحاق صاحب[۱] انہیں وطن واپس لے جانے کے لئے دہلی آئے لیکن سید صاحب

---

[۱] انہوں نے شاہ عبدالعزیزؒ اور شاہ عبدالقادرؒ سے استفادہ کیا تھا

کی مشغولیتوں اور شان و شوکت کو دیکھ کر رائے یہ قائم کی کہ فارغ ہونے کے بعد گھر آنا اور وطن کو واپس چلے گئے۔ وطن والوں کو فخر و مسرت کے ساتھ سید صاحب کے حالات سے آگاہ کیا اور وہ سب حیرت و مسرت میں سید صاحب کے واپس آنے کی دعائیں مانگنے لگے۔

سید صاحب تبلیغ کے لئے دورہ پر روانہ ہوئے۔ یہ دورہ اپنی قسم کا عجیب و غریب دورہ تھا، اس کی جدت لذیذ تھی اور کامیابی قدموں سے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ شاہ عبدالعزیزؒ کا دوآبہ میں بے حد اثر تھا، ان کے مریدوں، شاگردوں اور رشتہ داروں نے جی و جان سے اس جماعت کا استقبال کیا۔ یہ جماعت ابتدا میں بیس رفیقوں پر مشتمل تھی، بعد میں تعداد سو سو اسو تک پہنچ گئی تھی۔ اتنی بڑی جماعت کے ساتھ دورہ کرنا بذات خود اشتہار تھا اور لوگوں کو مرعوب کرنے کے لئے کافی تھا۔ ہر جگہ وعظ فرمائے جاتے تھے، مذہبی اصول سکھائے جاتے تھے اور نذرانے لئے جاتے تھے۔ شاہ اسمٰعیل اور مولوی عبدالحی سید صاحب کی پالکی کے ڈنڈے تھام کر ادباً پیدل چلا کرتے تھے۔ یہ رعب ڈالنے والے نظارے اپنی جگہ علیحدہ اثر رکھتے تھے۔ یہ گشت پھلت، مظفر نگر، لہاری، سہارنپور، دیوبند اور نانوتہ وغیرہ میں ہوا تھا۔ اس کی مدت چھ ماہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جتنی مقبولیت یہاں ہوئی، اتنی کسی اور جگہ نہیں ہوئی۔ عام خیال تھا کہ تاریکی و نحوست دور ہو جائے گی اور نئے سرے بہار آجائے گی۔ جناب مہر صاحب نے لکھا ہے کہ دورہ ختم کر کے جب دہلی واپس آئے تو اپنے

بھائی سید محمد اسحاق کے انتقال کی خبر سُنی، لہٰذا وطن جانے کے لئے مجبور ہو گئے۔ بقیہ تذکرے متفق البیان ہیں کہ بڑے بھائی کے انتقال کی خبر سہارنپور کے قصبہ رام پور منہاران میں معلوم ہوئی تھی اور وہیں سے ساٹھ ستر رفیقوں کے ساتھ سیدھے وطن گئے تھے۔ اثنائے راہ میں مختلف مقامات گڈھ مکتیسر۔ امروہہ و مراد آباد میں تبلیغ کرتے ہوئے ریاست رامپور پہنچے اور وہاں کچھ دن قیام فرمایا۔ روایتیں واضح نہیں ہیں، بہر حال رامپور منہاران میں یا ریاست رامپور میں کسی افغانی نے مسلمانوں پر سکھوں کے مظالم کی داستان سنائی تھی۔ بھائی کے انتقال کا صدمہ تو تھا ہی مگر اس داستان سے دل ہل گیا۔ پھر ریاست رامپور سے بریلی وغیرہ میں تنظیم و تبلیغ کے جلسے کرتے ہوئے شعبان ۱۲۳۶ھ کی چاند رات کو مطابق ۲۴ جون ۱۸۲۱ء دس سال کی غیر حاضری کے بعد وطن مالوف رائے بریلی میں تشریف فرما ہوئے۔ یہاں چھبیس مہینے قیام کیا یعنی ۲۳ اگست ۱۸۲۱ء تک تبلیغی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ اہل وطن کے اختلافات دور کئے، سب میں صلح کروائی۔ اعتقادات کی درستی میں خاص سعی کی۔ شرک کے معنی تفصیل کے ساتھ سمجھائے۔ بدعتوں کی تردید کی وعظ ہوتے رہے تعزیوں کے جلوس کے متعلق قریب کے گاؤں نصیر آباد میں شیعہ و سنی اختلاف کو دور کروانا چاہا، صلح نہ ہو سکی مگر جلوس نہیں نکلا مجتہد صاحب نے لکھنو جاکر حکومت سے شکایت کی، اس پر سید صاحب کی طلبی ہوئی مجرم بن کر لکھنو گئے تھے اور فاتح بن کر وہاں سے واپس آئے لکھنو

کے تکلفات و نمائشی اصول سید صاحب کی سادگی سے مات کھا گئے
ان صاحبان نے سب کو زیر کر لیا۔ جب ان کی فوقیت مسلم ہو گئی تو قبولیت
عامہ حاصل ہوئی۔ حیرت ہے کہ دہلی کی طرح یہاں تسلیمات و کورنش اور
اداب کے متعلق کوئی تنبیہہ نہیں فرمائی۔ لکھنو سے آکر جب دیکھا کہ
نکاح بیوگان کے اجراء پر کوئی کان نہیں دھرتا تو مثال قائم کرنے کے
لئے اپنے بڑے بھائی کی بیوہ سے خود نکاح کیا، پتہ نہیں زوجہ اولیٰ
موجود تھیں یا نہیں، پھر تو یہ ہندوانہ رواج غائب ہونا شروع ہو گیا۔ اس
سلسلہ میں تذکرہ رشیدی کی روایت پُر لطف ہے۔ یعنی بعد نکاح ثانی
سید صاحب فجر کی نماز میں دیر سے آنے لگے، آخر کار مولوی عبدالحی کو
عرض کرنا پڑا کہ عبادت الٰہی ہو گی یا شادی کی عشرت۔ سید صاحب نے
اپنی غلطی کا اعتراف کیا۔ پھر کبھی تاخیر نہیں ہوئی۔ اسی زمانہ میں یعنی ۱۸۲۰ء
میں صراط مستقیم منصۂ وجود میں آئی تھی۔ سید صاحب اپنا مفہوم بنا دیا
کرتے تھے اور مولوی عبدالحی اور شاہ اسمٰعیل اپنی اپنی عبارتوں میں اسے
نقل کر دیا کرتے تھے، لیکن شہرت یہی ہے کہ یہ کتاب شاہ اسمٰعیل نے
لکھی ہے۔ بہر حال اس سے تقویت الایمان منسوخ ہو گئی

اب یہاں معتقدین کا مجمع چار سو کے قریب رہنے لگا۔ باوجود
اسباب کے فقدان کے سب کی تواضع دل کھول کر کی جاتی تھی اور کسی
کو طعام و قیام کی تکلیف یا شکایت نہیں ہوتی تھی۔ رامپور میں قلب کے
اندر ایک پٹھان سے جو گتھی تھی وہ برابر کھٹکتی رہتی تھی۔ اب سال دو سال

میں اپنی مساعی جمیلہ کی مقبولیت دیکھ کر گمان ہوا کہ کارِ تبلیغ اتمام کو پہنچ گیا اور قلوب جہاد کے لئے تیار ہو سکیں گے۔ لہٰذا بہ یک کرشمہ دو کار کے اصول پر اشاعتِ دین کے ساتھ جہاد کی بھی تلقین کی جانے لگی۔ جب جہاد کا تہیہ کر لیا تھا تو کچھ دن کے بعد اعلان کر دیا کہ وِرد و وظائف ختم کئے جائیں۔ عزلت نشینی کا حاصل کچھ نہیں، فنونِ جنگ سیکھنے کی ضرورت ہے۔ روحانیت کو اس سے زیادہ تقویت پہنچے گی۔ کس کی مجال تھی کہ کوئی دم مارتا مگر مولانا مہر صاحب کی روایت کے مطابق عبد الرحیم کاندھلوی کی وساطت سے لوگوں نے اس اعلان کے معنی سمجھنے چاہے استفسار پر مسکت جواب دے دیا گیا کہ مجاہد کا درجہ عابد سے بڑھا ہوا ہے اس کے برخلاف سیرت سید احمد شہید کا بیان ہے کہ مولوی یوسف کے استفسار پر یہی تشریح فرمائی تھی اور کہا تھا کہ جس کی سمجھ میں نہ آئے وہ شاہ عبد الرحیم ولایتی سے اپنا اطمینان کرے۔ یہ حاجی عبد الرحیم فاطمی ولایتی شاہ عبد الباری امروہوی کے سلسلہ صابریہ میں خلیفہ مانے جاتے ہیں لیکن اس سلسلہ کو ترک کر کے سید صاحب کے خلیفہ بن گئے تھے جس کا خود انہوں نے اقرار کیا ہے[۱]۔ جب ان حضرات سے لوگوں نے مطلب سمجھنا چاہا تو انھوں نے سید صاحب سے اپنی بیعت کی داستان سنائی۔ پھر سمجھایا کہ گھاس کھودنے، لکڑی کاٹنے۔ مٹی ڈھونے، دیوار بنانے اور جسمانی محنت کرنے سے مجھے بے حد روحانی ترقی حاصل

---

[۱] اس روایت کی تصدیق جب تذکرہ رشیدی و سوانح قاسمی سے ہوگئی تو رسالہ منادی دہلی کی بارھویں اشاعت ۱۳۶۲ھ میں میں نے مضمون لکھا تھا۔ کہ اس حساب سے حضرت فاطمی کی شاخ کو حق نہیں ہے کہ اپنے آپ کو صابری کہے۔ واللہ اعلم

ہوئی جو پہلے وِرد وظائف سے نہیں ہوئی تھی۔ بہرحال اس نئے حکم کے بعد بجائے تسبیح کے یہاں ہر ایک کے ہاتھ میں تیر و تفنگ نظر آنے لگے۔ مصلے پر بیٹھنے کے بجائے ہر شخص کبڈی کھیلنے لگا۔ اس طرح روحانیت میں بیقیاس ترقی ہونے لگی، جب جسمانی مشقت سے رُوحانی معراج حاصل ہو گئی تو ایک نیا مکان اور دو نئی مسجدیں تعمیر کروائی گئیں۔ اشاعت جہاد کے لئے جب دورہ کیا جاتا تھا تو جلو میں ایک سو ستر غازی ہُوا کرتے تھے چنانچہ فوجی قواعد کے ساتھ سیلون۔ کانپور۔ الہ آباد۔ بنارس اور سلطانپور وغیرہ کے دورے کئے گئے۔ جناب مہر صاحب کا خیال ہے کہ "جہاد کے غلبہ و جوش کی داستان سوانح نگاروں کے تخیل کا کرشمہ ہے ورنہ جہاد تو پہلے ہی سے ان کی سرشت میں داخل تھا اور انتہائی مقصد تھا" لیکن یہ دعویٰ محض قیاسی ہے اور اس صورت میں مہر صاحب کا یہ خیال خود ان کے تخیل کا کرشمہ ہے۔ بقول حیات طیبہ اپنی بیعت سے بہت پہلے شاہ اسمٰعیل سکھوں سے جہاد کا تہیہ کر چکے تھے اور جذبۂ جہاد ان کی سرشت میں داخل تھا تاریخ بتاتی ہے کہ ۱۸۰۰ء میں رنجیت سنگھ نے اپنی حکومت قائم کی تھی اور مسلمانوں پر ظلم کئے تھے۔ اسی زمانہ میں دہلی کے ریزیڈنٹ سے شاہ اسمٰعیل کے مراسم دوستی قائم ہوئے تھے اور اس کے بعد انہوں نے پنجاب کا خفیہ دورہ کیا تھا۔ اسی وقت بیعت کرنے کے بعد سید صاحب دہلی سے اپنے وطن گئے تھے اور انہیں سکھوں کی سیاست کی مطلق خبر نہ تھی۔ پھر دس سال بعد ۱۸۱۹ء میں ٹونک سے دہلی آئے تھے اور شاہ اسمٰعیل

وغیرہ کو بیعت سے مشرف فرمایا تھا، اب جبکہ افغانیوں نے رامپور میں سکھوں کے مظالم بیان کئے اور سید صاحب متاثر ہوئے تو شاہ اسمٰعیل کو ترغیب دینے کا موقع ملا، رفتہ رفتہ مختلف پہلو دکھاتے ہوئے سید صاحب کو آمادہ کر لیا اور خوب اچھی طرح سمجھا دیا کہ شرع میں جہاد افضل ترین عبادت ہے اس کے بعد خوب غور و خوص کر کے سید صاحب نے جہاد کا حکم شائع کر دیا اور جہاد کی تیاری شروع کر دی۔ اصل یہ ہے کہ بنیادی خیال جہاد کے متعلق شاہ اسمٰعیل کا تھا جو شاہ ولی اللہؒ کی تحریک اور شاہ عبدالعزیز کے منظوم عربی خطوط سے جو انہوں نے اپنے چچا کو لکھے تھے، اخذ کیا تھا۔ مگر چونکہ سید صاحب شاہ عبدالعزیز کے بنائے ہوئے سردار قافلہ تھے، اس لئے اس کا سہرا انہیں کے سر باندھا گیا۔ اس بنا پر شاہ اسمٰعیل اور مولوی عبدالحی کو اسی طرح ولی گر بنا دیا گیا جس طرح سید برادران مغلوں کے یہاں بادشاہ گر مشہور تھے۔

جہاد کی تبلیغ کے ان دوروں کے بعد حکومت لکھنو کے نواب معتمد الدولہ نے لکھنو آنے کی دعوت دی تو سید صاحب نے مع خدم و حشم کے دوبارہ لکھنو کا دورہ کیا۔ اس مرتبہ علماء لکھنو اور شاہ اسمٰعیل سے حج کے ساقط ہونے پر بحث ہوئی۔ اور فریقین نے راہ کے خطروں کی وجہ سے حج کو ترک کرنے یا نہ کرنے کے متعلق فتوے لکھے۔ ان فتووں کو منشی خیرالدین لکھنوی نے شاہ عبدالعزیزؒ کی خدمت میں فیصلہ کے لئے بھیج دیا شاہ صاحب نے فیصلہ شاہ اسمٰعیل کی موافقت میں کیا کہ خطرات راہ کی وجہ

سے حج ساقط نہیں ہو سکتا۔ اس سے بہت پہلے اپنی تفسیر عزیزی میں یہی امر واضح کر چکے تھے لیکن شاید سید صاحب کو اس کا علم نہ تھا، اس وقت اس مناظرے اور فتوؤں سے سید صاحب کی توجہ اس طرف مبذول ہوئی اور سمجھے کہ جہاد سے پہلے حج کے فرض کو ادا کر کے سقم کو دور کر لینا چاہیئے۔ اس کے علاوہ خطرات راہ کی وجہ سے حج کو ترک کر دینے کا رواج پیدا ہو رہا تھا، اس کی تردید بھی منظور تھی۔ لہٰذا وہ اسی فکر میں مبتلا ہو گئے۔ اس سفر لکھنؤ میں ایک نعمت غیر مترقبہ بھی ہاتھ لگی۔ یعنی مولوی اشرف علی لکھنوی کے شاگرد مولانا ولایت علی عظیم آبادی بڑے دم خم سے مباحثہ کرنے آئے تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ رام ہو کر نہ صرف حلقہ بگوش ہوئے بلکہ سید صاحب کے ساتھ بھی ہو لئے اور مرتے مرتے انہیں کا نام لیتے رہے۔

خدا جانے کونسی بات صحیح ہے۔ بہرحال بنارس یا لکھنؤ کے سفر سے واپس آ کر سید صاحب نے اپنے ارادتمندوں کو دنگ کر دیا، ارشاد فرمایا کہ بجائے جہاد کے حج کی تیاری کی جائے۔ سب کو حیرت ہوئی مگر سب نے سر تسلیم خم کر دیا کہ[ف]

ہمیں تو خو ہے کہ جو کچھ کہو۔ بجا کہیئے

ف معلوم نہیں یہ فرنگی محلی تھے یا نہیں۔

پانچواں باب

حج

جہاد کی راہ میں قدم اُٹھنے ہی والا تھا کہ حج کا ارادہ کرلیا گیا۔ ارادۂ جہاد کی منسوخی کی وجہ جو بتائی گئی ہے اس کا ملخص یہ ہے:-

سوانح احمدی :- اعلان حج بنارس سے واپس آکر کیا تھا صاحب مخزن احمدی کے حوالہ سے کہا جاتا ہے کہ بچپن سے طبیعت میں شوق اعلاءِ کلمۃ اللہ و انطفاءِ نائرہ کفر و بدعت کا بھرا ہوا تھا۔ اس واسطے ہر گھڑی جہاد و قتالِ کفار کا ارادہ کرتے رہتے تھے اور سرکار انگریزی گو کافر تھی مگر اس کی مسلمان رعایا سے آزادی اور سرکار کی بے روریائی اور بوجہ موجودگی ان حالات کے ہماری شریعت کے شرائط سرکار انگریزی سے جہاد کرنے کے مانع تھے۔ اس واسطے (سکھوں کے مظالم کی وجہ سے) سکھوں پر جہاد کا ارادہ کیا، مگر جہاد کا کام آسان نہ تھا۔ آپ نے چاہا کہ جہاد کرنے سے پہلے فرضِ حج کو ادا کرلیں اور بعد ادائے اس فرض کے سکھوں سے جہاد شروع کریں۔

سیرت سید احمد شہید :- محبت و شوق و جذب الٰہی کا ... شدید تقاضا تھا کہ حج کو چلئے ..... سید صاحب جن کو

اللہ تعالیٰ نے مردہ سنتوں کو زندہ کرنے کے لئے پیدا کیا تھا۔ فرض کو کس طرح نہ کرتے۔ حج عرصہ سے ... متروک ہو گیا تھا۔ حج ... جہاد کا بھی مقدمہ ہے۔ سید صاحب نے حج کی تیاری کر دی۔

حیاتِ طیبہ :۔ ابھی مجاہدین اور روپیہ جمع ہونے کے لئے عرصہ دراز کی ضرورت تھی۔ اس نظریہ سے بہتر سمجھا گیا کہ حج بیت اللہ ہی کر آنا چاہیئے۔ جب تک خلفاد چندہ اور آدمی جمع کر رکھیں گے۔

سید احمد شہید :۔ ... چنانچہ لکھنو سے مراجعت کے تھوڑی دیر بعد آپ نے رفقائے خاص ... کو رائے بریلی سے رخصت فرما دیا تھا کہ اپنے خانگی معاملات سے فراغت حاصل کر لیں ... (تاکہ جہاد کے لئے چل سکیں) ... اس اثنا میں اچانک آپ نے ادائے حج کا ارادہ فرما لیا ... فرمایا کہ اب حج کو چلیں گے ... حیرت کو دور کرنے کیلئے فرمایا۔ اب مرضی الٰہی یہی ہے کہ پہلے حج کیا جائے ...

میرے نزدیک اس فیصلہ کی وجہ یہ تھی کہ حج جو متروک ہو گیا ہے اس کو جاری کرنے کی تدبیر یہی تھی کہ خود حج کریں۔

ان بیانات سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ دراصل غیب سے تنبیہ ہوئی تھی کہ قصدِ جہاد قبل از وقت ہے۔ ابھی شرائط پورے نہیں ہوئے ہیں اور وہ شرائط کیا تھے کہ جہاد جائز ہو جاتا؟ ان شرائط کے سمجھنے میں غالباً مغالطہ ہوا۔ اس سے پہلے تبلیغ وتنظیم سے رُخ پھیر کر جہاد کا ارادہ کیا تھا۔ سکھوں کے مظالم کی داستان جو افغانی نے سنائی تھی

اسی کو جہاد کے لئے اشارۂ غیب سمجھ لیا تھا اور اس اشارۂ غیبی کی تائید و تصدیق شاہ اسمٰعیل نے کی تھی۔ لکھنو کے مناظرے اور شاہ عبدالعزیز کے فیصلے کا اثر یہ تھا کہ سقم کو محسوس کیا۔ اس تفصیل کے معنی یہ ہیں کہ شاہ اسمٰعیل ہی کی وجہ سے دو سہو واقع ہوئے اور اشارۂ غیبی کو دونوں مرتبہ غلط سمجھا گیا۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ماحول کے اثرات کی وجہ سے معنی کچھ سے کچھ لے لئے جاتے ہیں۔

خاکم بدہن :۔ بلا تشبیہ عرض ہے کہ روحی فداہ حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے خواب میں حج کے متعلق کچھ بشارت پائی تھی، اس کو سُن کر حضرات صحابہ رضوان اللہ تعالےٰ عنہم اجمعین باغ باغ ہو گئے۔ جب انتظار کرتے کرتے تھک گئے تو کسی مناسب موقع پر اپنی بیتابی و بے قراری کا عجز و ادب کے ساتھ حضورِ نبویؐ میں اظہار کیا اور رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم زیارت بیت اللہ کے لئے آمادہ ہو گئے حدیبیہ پہنچ کر معلوم ہوا کہ عمرہ ممکن نہیں۔ معاہدہ کرنے کے بعد حدیبیہ سے واپس آنا پڑا۔ ایمان و خلوص بھرے ہوئے قلوب میں تلاطم پیدا ہوا۔ لہٰذا بذریعہ وحی مژدہ سُنایا گیا کہ معاہدہ حدیبیہ فتح مبین ہے، اب غم غلط ہوا اور مسلمانوں کے قلوب میں یقین نے مسرت کی لہر دوڑا دی۔ تعجیل کا سہو خوشخبری ثابت ہوا اور یہی سہو رحمت و نعمت کا مستحق بن کر فتح مکہ کا سبب ٹھہرا

الحمد للہ رب العالمین ۵

بہرحال ظاہری و باطنی وجہ کچھ ہی ہو جب حج کے متعلق رائے قائم کرلی گئی تو اعلان کر دیا گیا۔ دعوت نامے بھیج دیئے گئے اور یہ بھی مشتہر کر دیا کہ کل مصارف کے ذمہ دار سیّد صاحب ہوں گے۔ بغیر اسباب کے اس قسم کا اعلان حیرت زا ہو سکتا ہے اور اس پہ کرامت کا شبہ کیا جا سکتا ہے مگر اس میں نہ حیرت کی بات ہے اور نہ کرامت کا کوئی شائبہ ہے۔ سیّد صاحب کے اثرات اس کے ضامن تھے چشم زدن میں ہزاروں کا چندہ جمع ہو جانا ممکن تھا اور ہوا بھی ایسا ہی۔ اس کے علاوہ خدا خود میر سامان است ارباب توکل را جب عازمین و زائرین کی تعداد چار سو ہو گئی تو ۱۲۳۶ھ (۱۸۲۱ء) میں بقول مولانا مہر صاحب شوال کی آخری تاریخ کو یا بقول دیگر حضرات بعد نماز عید یکم شوال کو یہ قافلہ رائے بریلی سے روانہ ہوا اور ساڑھے چار ماہ بعد غالباً صفر ۱۲۳۷ھ میں کلکتہ پہنچ گیا۔ اثنائے راہ میں جن جن مقامات میں قیام فرمایا[1]۔ وہاں دل کھول کر شاندار استقبال ہوا۔ فتوحات حاصل ہوئیں۔ کرامتوں کی بارش کی گئی اور تبلیغ فرمائی گئی۔ کس و ناکس سے بیعت لی گئی۔ ردّ بدعات۔ منع شرک اور ترغیب احکام شرعی کے متعلق شاہ اسمٰعیل

---

[1] ڈالمئو۔ دھمی دھمہ۔ ڈلگڈی۔ گنگنہ گیا۔ اوجھنی اور چیری۔ الہ آباد۔ سرسا۔ مرزا پور۔ چنار گڈھ۔ بنارس۔ زمانیہ۔ غازی پور۔ ساڑا۔ بلیا۔ بکسر۔ چھپرا۔ دانا پور۔ پھلواری شریف۔ عظیم آباد۔ باڑھ۔ مونگیر۔ بھاگل پور۔ راج محل۔ مرشد آباد۔ ہگلی۔ چربٹ۔ شیورام پور۔ کلکتہ ان مقامات سے گرانقدر رقمیں اور قیمتی سامان فتوحات میں ملا۔

اور مولانا عبدالحی اپنے اپنے وعظ سے لوگوں کو تلقین کرتے تھے اور سید صاحب کی کرامتیں قلوب پر تصدیق کی مُہر لگا دیتی تھیں۔ اس سفر کے حالات سے یہ بھی ترشح ہوتا ہے کہ ہر قیام میں جس جس نے مدارات کی، ان میں زیادہ تر وُہ اُمرا اور رؤسا تھے جن کا تعلق انگریزوں سے تھا اور بعض جگہ خود انگریزوں نے بھی تواضع کی تھی۔ قصبہ مجھاون کی مسجد میں ہاتفِ غیب نے بشارت دی کہ سب ہمراہیوں کو بخش دیا۔ اور غیبی ہاتھ نے مسجد کو اُٹھا کر جنتِ ماویٰ میں داخل کر دیا۔ بمقام ڈلمئو قادر برحق کے وعدے کا اعلان فرمایا کہ ہمارے ساتھی اب اللہ کے مہمان ہیں اور میرے ہاتھ سے لاکھوں کو ہدایت نصیب ہو گی۔ دعائے فتح باب حرمین مستجاب ہوئی۔ کلکتہ پہنچ کر مولانا عبدالحی سے فرمایا۔ اگرچہ ہم حج کی نیت سے آئے ہیں، لیکن خدا کے فضل سے اُمید ہے کہ اس شہر میں باب ہدایت اس طرح مفتوح ہو گا کہ دیکھنے والے حیران ہو جائیں گے۔ معلوم ہوتا ہے کہ بمبئی کے بجائے کلکتہ آنا یوں پسند کیا تھا کہ کلکتہ انگریزوں کے زیر اثر تھا اور دیکھی تھا۔ پھر یہاں کثرت سے شاہ عبدالعزیز کے مرید و شاگرد بھی تھے۔ کلکتہ میں قیام تین ماہ امین الدین احمد وکیلِ سرکار کے یہاں کیا اور ان کی طوائف سے (گناہ سے بچانے کے لئے) ان کا نکاح پڑھوایا۔ کلکتہ کے متعلق جو پیشین گوئی کی تھی وہ تقریباً ٹھیک نکلی۔ شب و روز نیازمندوں کا میلہ لگا رہتا تھا۔ دورانِ قیام میں کلکتہ رشکِ ادھم بن گیا تھا۔ تمام بدعتوں کا انسداد کیا

نیکیوں کا سبق سکھایا۔ بعض حاسدوں نے انگریزوں سے شکایت بھی کی مگر اُلٹا اثر ہوا۔ انہوں نے حاجی جیون کی معرفت اپنے یہاں وعظ فرمانے کی درخواست کی اور شاہ اسمٰعیل نے دس ہزار انگریز مرد اور عورتوں کے مجمع میں جاکر وعظ فرمایا جس کو سُن کر سب کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ انگریزوں نے نذرانہ پیش کیا تو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ مولانا مہر صاحب نے اپنی کتاب میں انگریزوں کے یہاں کے اس وعظ کا ذکر نہیں کیا ہے۔ پھر کلکتہ کے کسی اور جلسہ میں سوانح احمدی کی روایت صحیحہ کے مطابق شاہ اسمٰعیل سے کسی نے سوال کیا تھا کہ انگریزوں سے جہاد جائز ہے یا نہیں؟ تو شاہ اسمٰعیل نے جواب دیا تھا کہ ایسی بے رو و ریا اور غیر متعصب سرکار سے کسی طرح بھی جہاد کرنا درست نہیں (بحوالہ مخزن احمدی) مولانا مہر اس کو بھی تسلیم نہیں کرتے غرض بقول سیرت سید احمد شہید عازمین حج کی تعداد الہ آباد میں چار سو سے بڑھ کر سات سو تک پہنچ گئی تھی اور بقول جناب مہر صاحب کلکتہ سے روانگی کے وقت سات سو تریپن ہو گئی تھی۔ گویا کلکتہ میں صرف ۵۳ کا اضافہ ہوا تھا۔ اس سے کلکتہ میں باب ہدایت کے مفتوح ہونے کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس قافلہ کے لئے دس یا گیارہ جہاز کرایہ پر لئے گئے تھے مگر ان جہازوں میں دوسرے مسافر بھی تھے

الوداعی جلوس کا نظارہ مسلم و غیر مسلم اپنی اپنی چھتوں سے دیکھ رہے تھے اور لاٹ صاحب نے بھی اپنی کوٹھی سے تماشا دیکھا تھا۔
(سیرت سید احمد شہید)

اس کے بعد سیلون۔ ایپی کالی کٹ۔ لنکا ویپ۔ ایلنی۔ عقیدی بنقوطرہ عدن۔ باب المندب مخا۔ حدیدہ۔ جدہ اور حدیبیہ کی راہ سے ۲۸ شعبان ۱۲۳۷ھ مطابق ۲۱ مئی ۱۸۲۲ء کو مکہ معظمہ میں داخل ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ اثنائے سفر کے عجائب و غرائب بے شمار ہیں جن میں سے بعض سید صاحب نے خود اس خط میں لکھے ہیں جو مکہ معظمہ سے شاہ عبدالعزیزؒ کو لکھا تھا اور جس کو شاہ اسمٰعیل نے چھپوا کر شائع کیا تھا۔ سوانح احمدی کے مکتوب نمبر اصل ۱۶۹ کا خلاصہ یہ ہے۔

"آخر ماہ شعبان ۱۲۳۷ھ ہم بخیریت مکہ معظمہ پہنچ گئے۔ بعد از حج زیارت مدینہ کا عزم ہے.... (مختلف مشغولیتوں کا ذکر کرنے کے بعد).... نئے مکان کی روحانیتؒ نے رائے بریلی سے چلنے وقت مجسّم ہو کر گریہ وزاری کی۔ میں نے بحکم خدا اسے جنّت میں ساتھ لے جانے کا وعدہ کر کے تسلّی دی۔ ڈلمئو سے جب ہم کشتیوں میں روانہ ہوئے تو اللہ تعالےٰ نے مجھے بتایا کہ فلاں کشتی میں نہ بیٹھنا۔ اسے غرق کر دینے کا حکم ہے مگر میں اپنی خطا محسوس کر کے اسی میں سوار ہو گیا۔ غیب سے ارشاد ہوا کہ تیری وجہ سے ہم نے اپنا حکم واپس لے لیا۔ جب کلکتہ سے چل کر دریائے شور میں پہنچے تو سمندر کی روحانیتؒ نے مجسّم ہو کر مجھے مرعوب کرنا چاہا۔ میں نے کہا کہ میں اور تو دونوں اللہ کے بندے ہیں۔ تو اللہ سے ڈر۔ میں تجھ سے ڈرنے والا نہیں ہوں۔ تو وہ محجوب ہو کر قائل ہو گئی۔ جب جہاز قاب

دقمری میں پہنچا جو بے حد خطرناک مقام ہے تو تجلّی نمودار ہوئی اور فرمایا، تجھے غرق کر دیا جائے گا۔ مَیں نے سرِ نیاز جھکا دیا۔ ارشاد ہوا کہ اب ہم غرق نہیں کریں گے[۱]۔ عدن میں نماز جمعہ وہاں کی جامع مسجد میں پڑھنا چاہتا تھا مگر اہلِ قافلہ کی وجہ سے متردّد تھا کہ ان کو ساتھ لے جانا مشکل ہے۔ بشارت ہوئی کہ تُم نماز پڑھنے جاؤ۔ جہاز پر قافلہ کی نگرانی ہمارے ذمّہ ہے۔ ۔ ۔ ۔ میری دُعا کی اجابت کی بشارت دیدی گئی کہ تیرے ہاتھ سے نشر و اشاعت ملک عرب میں ہوگی اور اس کے آثار اقالیم روم تک پہنچیں گے۔ ۔ ۔ ۔ مکّہ میں اسی طرح ایک ماہ کے قیام میں ہزاروں نے بیعت کی۔ بتایا گیا اس سال جتنے حج کریں گے تیری وجہ سے سب کو بخشدوں گا۔ محاذ یلملم پر احرام کے لئے مَیں نے غسل کیا۔ جن لوگوں نے مجھے غسل کرایا۔ ان سب کی بخشش کی اطلاع دی گئی، پھر خبر دی کہ جو تلبیہ میں تجھ سے سبقت کرے گا اس کا تلبیہ مَیں نہیں سنوں گا۔ بیرِ ذی طویٰ سے گذر کر عجیب حالت طاری ہوئی اور حاضرین نے دیکھا کہ میری لبیک کو شرف اجابت ہوا اور ارشاد ہوا کہ جتنے گنہگار و شرمندہ۔ دُور سے ہمارے حرم میں آئے ہیں۔ ان کو مَیں لایا ہوں۔ اور ان کا مدعا یہ ہے تو وہ خود مستحق رحمت و عنایت ہیں اور کچھ ایسا محسوس ہوا کہ ہند سے اقصائے بخارا تک سب کو بخش دیا مجھے خطرہ و خیال ہوا کہ یہ عنایات محض احیا کے لئے ہیں یا اموات

---

[۱] اس خوشی میں سیّد صاحب نے جہاز پر محفلِ میلاد منعقد کی تھی۔ (سوانح احمدی ص۸۵)

بھی اس میں داخل ہیں۔ جواب ملا کہ سب کے لئے ہیں۔ چنانچہ سب کو رنج و تکلیف سے نجات مل گئی اور وہ سب خوش ہو گئے ..... (آخر میں تحریر ہے کہ) ..... دریں سفر سعادت اثر بسیار بشارات و عنایات رفیعہ از درگاہ رحمان جل شانہ، ایں فقیر یافتہ است اور یہ سب آپ کی توجہ کا صدقہ ہے۔ آیندہ بھی دعا فرمایئے (اور اس خط کو اس جملہ پہ ختم کیا ہے کہ) زیادہ بجز آداب[1] چہ عرض نماید۔ والسلام والاکرام"۔

اس خط کو سن کر شاہ صاحب کے دوست مولوی محمد نعیم صاحب نے اعتراض کیا تھا، بجائے فی البدیہہ اور زبانی جواب دینے کے شاہ صاحب نے بعد میں بذریعہ خط وضاحت فرمائی ہے۔ (ملاحظہ ہو ضمیمہ سوانح احمدی خط نمبر ۲)

"از جانب خدا برائے تربیت طفلان طریقت کہ تابع شخصے شوند و اظہار السوئے فطرت رضا کنند۔ اتفاق شود مانند آں کہ طفلے در مکتب می برند و استاد او ..... او را مواعید عمدہ می دہند کہ برائے تو خلعتے ساختہ ام ..... و علی ہذا القیاس ..... از روئے حدیث چہل ابدال کا وجود ثابت ہے ..... چہ تعجب است کہ میر سید احمد را بعضے مراتب حاصل شدہ باشد، لہذا انتظار باید کشید کہ حق تعالیٰ آثار ایں مواعید را بر منصۂ ظہور جلوہ گر سازد۔ پس ایں ہمہ صادق اند۔ زیادہ بجز ترقیات دارین چہ نویسد"۔

معلوم نہیں شاہ صاحب کا یہ خط ہے بھی یا نہیں۔ اس مضمون و عبارت کو سخن سنج ہی سمجھ سکتے ہیں۔ مرزا حیرت دہلوی نے لکھا ہے کہ ہمارے

---

[1] سید صاحب نے پہلی ہی حاضری میں اصلاح فرمائی تھی کہ خاندان شاہ صاحب میں آداب و تسلیمات کے بجائے السلام علیکم استعمال ہو مگر اس خط میں خود آداب استعمال کیا ہے۔ یہ یقیناً شاہ اسمٰعیل کی کرامت ہے۔

فاضل عبد القیوم بریلوی نے سیّد صاحب کے خاندان کا ذکر کیا ہے اور بڑی بڑی کرامتیں سیّد صاحب کے آبا و اجداد کی نہایت رنگ آمیزی سے بیان کی ہیں۔ مگر یہ تعجّب سے دیکھا جاتا ہے کہ باوجودیکہ مصنّف کتاب کرامات مافوق الفطرت کا قائل ہے۔ پھر بھی اس نے سیّد احمد صاحب کی ان کرامتوں کا جن سے ہمارے معاصر سوانح نویسوں کے صفحے سیاہ ہو رہے ہیں۔ کہیں بھی تذکرہ نہیں کیا ہے بلکہ بجائے اس کے پارسا، پرہیزگار صائم الدھر، سچّا۔ نیک بخت۔ شیریں کلام۔ خلیق۔ خود فروشی و خود نمائی سے کوسوں دُور جیسی صفتوں سے بریلوی نے سیّد صاحب کو یاد کیا ہے" لیکن ان کرامتوں کو مان بھی لیا جائے تو شاہ عبد العزیزؒ نے اپنے اس خط میں ان کی حقیقت بیان کر دی ہے کہ محض بچّوں کا کھیل ہیں۔

بہر حال ۲۸ شعبان ۱۲۳۷ھ کو حرم میں داخلہ ہُوا۔ یکم ذیقعدہ ۱۲۳۹ھ کو حجاز سے واپسی ہُوئی۔ مکّہ معظمہ میں ابتدائی قیام کی مدّت چار ماہ ہے اس دوران میں فتوحات۔ عنایات اور تقریر و اشاعت کا ذکر آب و تاب سے لکھا گیا ہے۔ مدینہ منورّہ میں ۲۵ دن یا ایک ماہ گذارا۔ پھر دوبارہ مکّہ مکرّمہ میں دو ڈھائی ماہ سے زیادہ قیام فرمایا۔ اس قیام کے حالات پر کچھ پردہ سا پڑا ہُوا ہے۔ سفر حج کے حالات راویوں اور سوانح نگاروں نے جو لکھے ہیں اُن کا مطالعہ و مقابلہ بصیرت افروز ہوگا، لہٰذا خلاصہ یہ ہے کہ :-

سوانح احمدی۔ جہاز سے اُتر کر جدّہ میں پانچ روز قیام کیا۔ بعد

نمازِ عشاء اونٹوں پر مکّہ معظمہ روانہ ہوئے۔ حدیبیہ میں یاروں کے ساتھ دُعاؤں میں مشغول رہے ...... داخلِ حرم ہونے پر مسجد کو دیکھ کر قافلے دلوں پر اس قدر رقّت و زاری طاری ہوئی کہ ہچکیاں بندھ گئیں یہاں تک کہ معلّم و مطوف اور حاضرین سب کے سب رونے لگے اور کہنے لگے کہ ہم نے اپنی ساری عمر میں ایسا بابرکت قافلہ کسی ملک سے آتا ہُوا نہیں دیکھا ... ملک عرب کے بہت سے لوگ آپ کے ہاتھ پر بیعت ہوئے۔ بلغار کے قافلہ کا ایک بہت بڑا عالم جو فارسی جانتا تھا، بیعت سے مشرف ہُوا۔ اسے ملک بلغار کی ہدایت کے لیے خلیفہ مقرر کیا اور ایک نقل صراطِ مستقیم کی عنایت فرمائی۔ مکّہ کے تین بزرگ، صاحبِ کمال، اولیا میں سے تھے۔ انھوں نے کشفِ باطن سے معلوم کر کے اطاعت و فرمانبرداری کی۔ یہ تینوں سیّد صاحب کے ساتھ طواف کیا کرتے تھے۔ جب ان پر اعتراض کیا گیا تو جواب دیا کہ اس بزرگ کا ہر طواف مقبول بارگاہ ایزدی ہے اور ان کے ساتھ طواف میں ساتھ رہنے والوں کا بھی طواف مقبول ہے ... جبلِ رحمت پر دعا مانگی کہ ہمارے قافلہ والوں میں سے کسی کو بھی ساتھ لقب حاجی کے ملقب نہ کرنا۔ سب مورخین متفق ہیں کہ بوجہ قبولیّت دُعا کے آج تک کوئی آدمی اس قافلہ کا حاجی کے لقب سے ملقب نہیں ہُوا اس واسطے قوی اُمید ہے کہ باقی دعائیں بھی قبول ہوئی ہوں گی ....
اب تیاری سفر مدینہ کی ہونے لگی۔ اثناء راہ میں عرب کے لٹیرے

گھاٹ میں تھے مگر کچھ ایسا ہوا کہ ان کے سردار نے حاضر خدمت ہو کر سر تسلیم خم کر دیا۔ آدھی رات کو وادیٔ فاطمہ میں حضرت ام المومنین میمونہ رضی اللہ عنہا کے مرقد مبارک پر واسطے زیارت کے تشریف لے گئے۔ صاحب مخزنِ احمدی کا بیان ہے کہ خلاف فصل ہمیں تازہ انگور کے خوشے ملے۔ وادیٔ صغریٰ میں جملہ مزارات کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ جب مدینہ تین کوس رہ گیا تو سید صاحب کو تجارہ آگیا۔ یہاں بھی لٹیرے حملہ کرنا چاہتے تھے مگر بخیر گذشت حضرت شاتون جنت اور حسنین رضی اللہ عنہم اجمعین نے خواب میں بشارتیں دیں۔ باوجود بیماری کے متبرکہ مکانات کی زیارتیں کیں۔۔۔۔ اہل مدینہ نے بیعت کی۔ دو دو گھڑی تک سید صاحب مرقد مبارک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے مراقب رہتے تھے۔ ۲۶ ربیع الاول ۱۲۳۸ھ کو خواب میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دی کہ مکہ کو واپس جاؤ کیونکہ شدت سرما سے قافلہ کو تکلیف ہو رہی ہے۔ لہٰذا ۲۹ ربیع الاول ۱۲۳۸ھ کو وہاں سے روانہ ہوئے۔ مکہ شریف میں آکر ۵ شوال کو ساڑھے چھ ماہ کے بعد وطن مالوفہ کو مراجعت کا الہام ہوا، پھر بادلِ محزون یکم ذلقعدہ کو جانب وطن روانہ ہوئے۔ جدہ میں چھ روز قیام کیا۔ اس سفر میں شاہِ جنات اور اس کی ذریات کو بھی بیعت کا شرف عطا کیا اور غائبانہ طور پر وہ حفاظت کے لئے ساتھ رہنے لگتے۔ اس کی مفصل تفصیل وزیر الدولہ نے اپنی کتاب میں لکھی ہے۔ "منا میں پندرہ روز قیام رہا، پھر یہاں سے چودھویں روز

بمبئی پہنچ گئے۔ بمبئی میں تھوڑا قیام کیا۔ یہاں سے ایک مہینہ کے بحری سفر کے بعد کلکتہ تشریف لائے اور دو ماہ سے زیادہ قیام رہا۔

حیات طیبہ:- بمبئی سے حج کے لئے روانہ ہوئے۔ جدہ پہنچتے پہنچتے دو تین جانیں تلف ہوگئیں۔ حاملہ عورتوں کے بچے پیدا ہوئے۔ ایک کا حمل گر بھی گیا تھا۔ جدہ والوں کو سید صاحب کے آنے کا علم نہ تھا۔ اس لئے آرام کرنے کا موقع مل گیا ورنہ وہ لوگ حاضر ہوکر بہت تکلیف دیتے۔ مکہ شریف میں پہلے سے خبر ہوگئی تھی کہ وہابیوں کا قافلہ آرہا ہے۔ وہابیوں کی پابندی شرع کی وجہ سے مکہ و مدینہ والے سخت مخالف تھے۔ سید صاحب وغیرہ کو شریف مکہ نے طلب کیا۔ انہوں نے اپنے عقائد کے متعلق صفائی پیش کر دی تو نجات ملی۔ پھر شریف مکہ نے اپنے یہاں مہمان رکھا۔ اس کے بعد ہر بلا سے ہر جگہ محفوظ رہے اور وطن کو بخیریت واپس آئے۔ حج بیت اللہ کے موقع پر نجدیوں سے ملاقات ہوئی تھی۔ اسی وجہ سے ڈاکٹر ہیو جیمز نے لکھا ہے کہ سید صاحب نے نجدیوں سے تعلیم حاصل کی تھی اور ان کے عقائد لئے تھے، مگر یہ غلط ہے، ان کو تعلیم دینے کے لئے ان کے ہمراہ خود شاہ اسمٰعیل۔ مولانا عبدالحی اور دیگر علماء موجود تھے۔ سید صاحب کا اثر بمبئی میں اتنا نہیں تھا جتنا کلکتہ میں تھا۔ ہندوستان آکر جہاد کی تحریک شروع کی۔ ۲۹ شعبان سنہ ۱۲۳۹ھ کو وطن میں داخل ہوئے۔

سیرت سید احمد شہید:- اس ارض مقدس میں آپ کا فیض بند نہیں ہوا۔ حجاز کے بعض نامور اہل علم و کمال و فضل و صلاح

بیعت میں داخل ہوئے۔ سید صاحب کے حکم سے مولانا اسمٰعیل اور مولانا عبدالحی نے برابر وعظ فرمائے۔ یہاں تمام ممالک اسلامیہ کے وفود آتے ہیں اس لئے باہر کے لوگوں کو بھی فیضیاب ہونے کا موقع ملا۔ یلغار کے قافلہ نے بیعت کی۔ مغربی قافلہ بھی بیعت سے مشرف ہوا۔ مولانا عبدالحی نے صراطِ مستقیم کا ترجمہ عربی میں کرکے اس کی نقلیں تقسیم کیں۔

بخیر و خوبی مراسم حج ادا ہوئے۔ جبلِ رحمت پر دعا مانگی کہ ہمارے قافلہ کا کوئی شخص بھی حاجی کے لقب سے ملقب نہ ہو۔ جاوا کے تین آدمیوں نے بیعت کی۔ مکہ مکرمہ سے آپ مدینہ منورہ حاضر ہوئے اور کافی قیام کیا۔ ۲۹ ربیع الاول ۱۲۳۸ھ کو مدینہ منورہ سے روانہ ہوکر مکہ معظمہ آئے اور وہاں رمضان و عید کے مہینے گذارے اور یکم ذیقعد ۱۲۳۸ھ کو مکہ مکرمہ کو الوداع کہا۔ ۲۹ شعبان ۱۲۳۹ھ کو دو سال گیارہ مہینے کے بعد وطن آئے۔

ایک مہینہ قیام کرکے مُخا سے چلے تو حدیدہ ٹھہرے

سید احمد شہید:۔ یلملم کے محاذ میں پورے قافلہ نے غسل کرکے عمرے کا احرام باندھا صدائے لبیک سے پورا جہاز گونج اٹھا، جدہ پہنچے تو جو ہمراہی پہلے پہنچ چکے تھے ان میں سے اکثر مکہ معظمہ جاچکے تھے۔ کچھ لوگ سید صاحب کے کے انتظار میں ٹھہرے رہے۔ مولانا اسمٰعیل کو یہاں محاصل کے تصفیہ کیلئے چھوڑ دیا اور خود روانہ ہوگئے کلکتہ میں مختلف جماعتوں کے امیروں کو کچھ رقمیں متفرق مصارف کے لئے دے دی گئیں تھیں۔ جدہ میں ان رقموں کا حساب لیا گیا معلوم ہوا کہ دو ہزار ایک سو روپیہ زائد خرچ ہوئے۔۔۔ سید صاحب نے یہ رقم ادا فرمائی۔۔۔

جدّہ سے چل کر ایک مقام حدیبیہ میں قیام کیا۔ پھر حدیبیہ ٹھہرے ..... تیسرے
روز چاشت کے وقت مکہ معظمہ میں داخل ہوئے ..... قافلے کے لوگ خدا
کے فضل سے عموماً ہر آفت سے محفوظ رہے۔ شاہ اسمٰعیل کی والدہ
ایسی بیمار ہوئیں کہ زندگی کی اُمید نہیں رہی۔ شاہ صاحب کی آرزو تھی
کہ والدہ صاحبہ سیّد صاحب سے بیعت کرلیں۔ لیکن وہ فرماتیں کہ یہ تو خود
ہمارے خاندان کے مرید ہیں۔ میں بیعت نہیں کر سکتی۔ شاہ صاحب دُعائیں
کرتے رہتے تھے۔ ایک رات مرحومہ نے خواب دیکھا تو اس کے مطابق سیّد صاحب
سے بیعت کرلی۔ اسی بیماری میں دوسرے دن فوت ہوگئیں اور جنت البقیع
میں دفن کی گئیں۔ اوائیگی حج کے موقع پر جبل رحمت پر دُعا مانگی کہ قافلے
والے حاجی کے لقب سے ملقب نہ ہوں۔ اس لئے کہ حج اسلامی فرض
ہے۔ اسے بجالانے پر امتیازی لقب کیوں اختیار کیا جائے۔ سینکڑوں
علماء صلحاء و اشراف سے ملاقاتیں ہوئیں۔ ان میں سے ایک صاحب مغرب
اقصیٰ کے تھے ..... حجازیوں اور بلغاریوں نے بھی بیعت کی۔ مولانا عبدالحی
نے حرم پاک میں مشکوٰۃ کا اور شاہ اسمٰعیل نے حجۃ البالغہ کا درس شروع کیا۔
مولانا عبدالحی نے اس اثنا میں صراط مستقیم کا ترجمہ عربی میں کیا جس کی نقلیں بعض
اصحاب نے لے لیں ..... اواخر محرم میں مدینہ منورہ کا قصد فرمایا۔ راستہ میں
سیّد صاحب سخت بیمار ہوگئے۔ بعض اوقات بیہوش ہوجاتے تھے مگر مدینہ منورہ
پہنچنے سے پہلے تندرست ہوگئے تھے۔ آدھی رات کے وقت مدینہ منورہ
پہنچے۔ مناخہ میں اُترے۔ غسل کرکے لباس بدلا۔ صبح کو شہر کا دروازہ کھلا تو

اندر داخلہ ہُوا۔ حرم مدینہ کے تمام مآثر کی زیارت کی۔ اس زمانہ میں نجدیوں سے ارباب حکومت بگڑے ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ جنگ کو ختم ہوئے چند ہی سال گذرے تھے۔ اگر کوئی شخص موحدانہ عقیدے کی اشاعت میں سرگرم ہوتا اور بدعات و محدثات کے رد میں سختی سے کام لیتا تو اسے وہابی سمجھ کر مواخذہ کا تختۂ مشق بنا لیا جاتا تھا۔ سید صاحب کے ساتھیوں میں مولوی عبدالحق نیوتنوی بہت تیز مزاج تھے۔ ان کی شکایت ہوئی کہ وہابی ہیں۔ ان پر مقدمہ چلا تو مولانا عبدالحی نے ضمانت و وکالت کر کے نجات دلوائی ....

بیت المقدس جانے کا ارادہ تھا مگر ہمراہیوں کے اضطراب کی وجہ سے ترک کرنا پڑا۔ اس لئے کہ سب کو لے جانا مشکل تھا اور پیچھے چھوڑنا گوارہ نہ تھا۔ مدینہ میں سردی تیز ہو گئی تو واپس آئے۔ دس گیارہ دن سفر میں لگے۔ ایک مہینہ مدینہ منورہ میں گذار کر ۲۹ ربیع الاوّل ۱۲۳۸ھ کو واپس ہُوئے۔ وزیرالدولہ نے لکھا ہے کہ جس روز مدینہ منورہ پہنچے تھے اسی روز رات کو بخار آ گیا تھا..... اپنے قیام گاہ کی کھڑکی میں روضۂ مقدسہ کے سامنے بیٹھ گئے۔ اسی حالت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے مشرف ہُوئے۔ عرض کیا کہ "غلام علی الہ آبادی نے جو قرآن شریف یہاں کی تلاوت کے لئے بھیجا ہے، اگر حضور اجازت دیں تو المامس صاحب کو وہ نسخہ دے دُوں، کیونکہ وہ باقاعدہ تلاوت کے عادی ہیں ورنہ یہاں قرآن شریف رکھے ہُوئے ہیں اور کوئی تلاوت نہیں کرتا..."۔ مکہ شریف اگر ہمراہیوں میں سے جن جن کے لئے جہاز میں جگہ نکلتی گئی انہیں

ہندوستان بھیجتے گئے۔ خود پہلے کی طرح مشغولِ عبادت رہے......
فرماتے ہیں کہ خیال آیا ہندوستان دار الحرب ہے۔ بہتر ہے کہ حرم پاک میں بیٹھا رہوں، لیکن غیب سے اشارہ ہوا کہ اگر تم نہیں جاؤ گے تو ہم اپنا کام کسی دوسرے سے لے لیں گے۔ اسی پر واپسی کا ارادہ پختہ ہو گیا۔ ۵ شوال کو مکہ سے چلے، ذیقعد کے آغاز میں جدہ سے روانہ ہوئے۔ اس وقت تک صرف اتنے ساتھی رہ گئے تھے کہ چار جہاز کرایہ پر لینا پڑے (گویا نصف سے زیادہ ساتھی روانہ کئے جا چکے تھے) مخا میں ایک مہینہ گذارا پھر ذوالحجہ کو بمبئی پہنچ گئے۔ وہاں سے ایلچی وغیرہ ہوتے ہوئے ۶ صفر ۱۲۳۹ھ کو کلکتہ آ گئے۔ کلکتہ میں خاصی دیر قیام رہا۔ پھر مختلف مقامات پر ٹھیرتے ہوئے دو سال دس ماہ بعد ۲۹ شعبان ۱۲۳۹ھ مطابق ۹ راپریل ۱۸۲۴ء کو وطن آ گئے۔ کچھ مدت بعد بیت المال کا جائزہ لیا تو دس ہزار روپے موجود تھے۔

سفر حجاز کے حالات و واقعات ہر راوی کے بیان کردہ اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں جس کا جیسا جی چاہا اپنے قیاس کے مطابق منہ میں لکھ دیئے ہیں۔ ان سب کی چگونگی اور بوقلمونی پُر لطف اور دلچسپ ہے اور ان سب کے اختلافات اصلیت کی نشاندہی کر دیتے ہیں۔ لب لباب ان بیانات کا یہ ہے کہ بشارتیں ہو چکی تھیں۔ مقبولیت حد سے زیادہ ہوئی اور حسب دستور کرامتیں بھی اپنے کرشمے دکھاتی رہیں۔ کرامتوں کی وقعت کی تشریح شاہ عبدالعزیز کا خط کر رہا ہے جو انہوں نے مولوی محمد نعیم کو لکھا تھا۔ ان کی مثال ایسی

ہے جیسے بچوں کو شوق دلانے کے لئے مٹھائی وغیرہ کا لالچ دیا جاتا ہے۔ اسی طرح ان اطفالِ طریقت کو ان عجائبات کے ذریعہ ترغیب دی جاتی ہے اور یہ ہمت افزائی کرنے کا ایک طریقہ ہے گویا اس وقت تک سیّد صاحب محض ایک طفلِ طریقت تھے۔ اس خط میں یہ بھی لکھا گیا ہے کہ شاید آگے چل کر سیّد صاحب ابدال بن جائیں اور اس گھڑی کا انتظار کرنا چاہیئے۔ ابدال عام طور پر مستتر اور مجذوب ہوا کرتے ہیں لیکن سیّد صاحب کے حالات سے ان خصوصیات کا پتہ نہیں چلتا لہٰذا گویم مشکل و نہ گویم مشکل کا معاملہ ہے۔ کشف و کرامات کے متعلق صراطِ مستقیم میں خود لکھا ہے کہ "ان طلسماتی نظاروں سے مومن کا ایمان، عزم و اتباعِ سنت بڑھتا ہے لیکن وہ کمال جو انسان سے مطلوب ہے، ان کشف و کشود سے حاصل نہیں ہوا کرتا" یہ حقیقت معلوم ہو جانے کے بعد ان کرامات کو جو سیّد صاحب سے منسوب کی گئی ہیں، عجائب پرستی اور نئی قسم کی بدعت ہی کہا جا سکتا ہے ان کرامتوں کے ذریعہ سیّد صاحب کو جھنجھنا بنانے کی کوشش کی گئی ہے اور یہ نہایت ذلیل حرکت ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ اس "قافلۂ مبشرہ" کے پہنچنے سے پہلے یہ خبر پہنچ گئی تھی کہ ان صاحبان کے عقائد وہابیوں جیسے ہیں۔ نجدیوں سے حجاز والوں کو نفرت تھی۔ لہٰذا اس خبر اور افواہ سے بدگمانیاں پیدا ہو جانا لازمی تھیں۔ قدم اوّل پہ شریف مکّہ نے ان کے عقائد کے متعلق استفسار کیا۔ معلوم نہیں تقیہ کیا یا منطقی مغالطہ دیا۔ بہرحال صفائی پیش

کر دی گئی کہ ان کے خیالات نجدیوں کے سے نہیں ہیں۔ یہ درون خانہ کی صفائی افواہ کی عام شہرت کو دور نہیں کر سکتی تھی۔ بد اچھا بدنام بُرا والی مثل تھی لہٰذا یہ جوش استقبال غلط اور دعویٰ مقبولیت معلوم۔ مرزا حیرت کا دعویٰ ہے کہ حج میں نجدیوں سے ملاقات ہوئی تھی اور انہیں انکار ہے کہ نجدیوں سے انہوں نے تعلیم حاصل کی بلکہ ان کے عقائد خود ہی پہلے سے ایسے ہی تھے اور اگر کوئی کمی تھی تو اس کے دور کرنے کے لئے شاہ اسماعیل وغیرہ ان کے ہمراہ موجود تھے۔ مولانا مہر صاحب مطلع کرتے ہیں کہ ترکوں اور مصریوں نے نجدیوں کو اس درجہ کچل دیا تھا کہ حجاز میں آنے کی نجدیوں کو ہمت ہی نہ تھی اور مدعا یہی ہے کہ ان صاحبان کے جو عقائد تھے وہ ذاتی تھے۔ مولانا تھانوی کے خلیفہ نے اپنی ملفوظات حسن العزیز کی جلد اوّل میں لکھا ہے کہ ترکوں کے تسلط کے بعد بھی حجاز میں نجدیوں کے خفیہ اڈے تھے اور خاموشی سے اپنے عقائد کی اشاعت کیا کرتے تھے، چنانچہ اپنے شیخ سے ایک نجدی کے مناظرہ کا حال لکھا ہے اور پھر اس نجدی سے توبہ کروائی گئی ہے۔ لہٰذا مرزا حیرت کے بیان کو جناب مہر صاحب کے بیان پر نجدیوں کے متعلق ترجیح دی جا سکتی ہے شیخ محمد اکرام صاحب موجِ کوثر میں اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ سیّد صاحب کو حجاز میں وہابیوں کے عقائد سے باخبر ہونے کا موقع ملا تھا۔ سیّد صاحب کے اور وہابیوں کے عقائد میں بہت اشتراک ہے۔ اسی لئے ان کے بہت سے ساتھی وہابی عقائد سے متاثر ہوئے تھے، چنانچہ شاہ اسماعیل نے

سفرِ حج سے واپس آنے کے بعد اپنے آپ کو غیر مقلد ظاہر کیا۔ البتہ مولانا عبد الحیؒ ان سے متفق نہیں تھے اور سیّد صاحب کے متعلق اختلاف رائے ہے۔" جناب اکرام صاحب کی یہ رائے مستشرقوں کی سی ہے جو محض قیاس کی بنا پر اظہارِ رائے کیا کرتے ہیں اور حقیقت پر نظر نہیں رکھا کرتے۔ مرزا حیرت اور جناب مہر صاحب کا دعویٰ ہے کہ حج کے موقع پر نجدیوں سے تعلیم حاصل نہیں کی اور یہ یقیناً صحیح ہے۔ جناب مہر نے مزید انکشاف کیا ہے کہ مدینہ طیبہ میں موحدانہ عقائد رکھنے کی بنا پر مولوی عبد الحق نیوتنوی پر مقدمہ چلا تھا۔ اگر تدبر کیا جائے تو تاریخ اعلان کرتی ہے کہ ترکوں کے تسلط کے بعد نجدیوں کا اثر مخا اور حدیدہ میں باقی و جاری رہا تھا میں سیّد صاحب کے طویل قیام کی وجہ درحقیقت اشتراکِ عقائد ہی تھی کہ آتے جاتے ہر مرتبہ وہاں مقیم ہوئے۔ قاضی محمد بن علی شوکانی نجدی کی کتاب "موضوعاتِ حدیث" بھی سیّد صاحب کو مخا کے قاضی صاحب کی معرفت میسر ہوئی تھی اور اشتراکِ عقائد ہی کی وجہ سے یہاں ہزاروں نے بیعت کی۔ حدیدہ میں ہندوستانی دوست نے دعوت کی تھی اور شاید اسی دوست نے سیّد صاحب کی تعلیم کو حدیدہ میں روشناس کیا تھا۔ قافلہ کے نجدی الخیال ہونے کی افواہ حجاز میں انہیں مقامات سے پہنچی تھی۔ ان تمام حقائق سے یہی برملا ثابت ہوتا ہے کہ اس قسم کے خیالات سیّد صاحب کے قافلہ کے سفرِ حج سے پہلے ہی کے تھے۔ اس کی تفصیل یہ ہو سکتی ہے کہ اس قسم کے موحدانہ عقائد محمد تغلق کے عہد میں موجود تھے

اسی زمانہ میں ابن تیمیہ کی تعلیم ہندوستان میں رائج ہوئی تھی۔ یہی تاریخی حقیقت ہے۔ پھر امام ربانی حضرت مجدد سرہندیؒ اور امام شاہ ولی اللہؒ کی اصلاحی تحریکوں اور رد بدعت کے ڈانڈے ابن تیمیہ کی تعلیم سے ملا کر موحدانہ عقائد کو اور بھی فروغ دیا گیا۔ اس مخلوط جدت کو عوام تمیز نہیں کر پائے اور ان کا اثر قبول کرنے پر مجبور ہو گئے۔ شاہ فخرؒ جو شاہ ولی اللہ کے ہم عصر ہیں اُن کے ملفوظات میں موجود ہے کہ محمد فاخر نے عرب سے آکر دہلی میں اسی قسم کی تبلیغ کی تھی اور نجدیوں کے اصول کے مطابق دہلی میں قبروں کو ڈھانا شروع کیا تھا۔ لوگ انہیں وہابی لہابی کہا کرتے تھے۔ لہٰذا شاہ عبدالعزیزؒ کے وقت میں نجدی تعلیم کا برابر چرچا تھا بلکہ ترقی تھی۔ کتاب التوحید کا نسخہ سب سے پہلے کوئی صاحب مراد آباد میں اسی وقت لائے تھے۔ مدعا یہ کہ اس قسم کا جملہ سامان دہلی میں سید صاحب کی بیعت اور تبلیغی دوروں سے پہلے ہی سے موجود تھا۔ شاہ عبدالقادرؒ کا وصال ۱۲۳۰ھ ۱۸۱۵ء میں ہوا تھا۔ ان کے بجائے اس سال مدرسہ کی مسندِ درس پر شاہ اسمٰعیل تشریف فرما ہوئے تھے۔ اسی زمانہ میں شاہ اسمٰعیل نے جامع مسجد میں وعظ فرمانا شروع کئے تھے اور ان وعظوں میں موحدانہ عقائد کا اعلان ہوا کرتا تھا اور اسی وقت اور وجہ سے علامہ فضل الحق خیرآبادیؒ سے مخالفت شروع ہوئی تھی۔ انہیں مخالفتوں کے سبب شاہ اسمٰعیل میں افراط و غلو کی شان پیدا ہوئی تھی اور انہوں نے ہر بات کو شرک سے تعبیر کرنا شروع کر دیا تھا، لہٰذا یہ تصور کہ وہابی عقائد حجاز میں جا کر قبول کئے تھے سراسر غلط ہے۔ صاحب سیرت

سید احمد شہید لکھتے ہیں کہ تقویۃ الایمان صراط مستقیم سے پہلے لکھی گئی تھی۔
"تحفۂ محمدیہ" میں بتایا گیا ہے کہ جس وقت شاہ اسمٰعیل تقویۃ الایمان لکھ رہے
تھے اُس وقت ان کا ایک شاگرد مسمی امام بخش ان کا مسودہ ہر روز نرات کو
مولانا مملوک علی کو لے جاکر دکھا دیا کرتا تھا اور وہ روزانہ اس حصہ کا رد لکھ لیا
کرتے تھے۔ چنانچہ جب تقویۃ الایمان مکمل ہوئی، مولانا مملوک علی کا رد بھی تکمیل
کو پہنچا۔ مولانا مملوک علی تقویۃ الایمان کا تلفظ قاف کو فے سے بدل کر کیا
کرتے تھے یعنی ایمان کو فوت کرنے والی کتاب۔ اب نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ
جامع مسجد کے مباحثوں کے بعد یہ کتاب لکھی گئی تھی، چنانچہ عام طور پر مشہور ہے
کہ تقویۃ الایمان لکھنے کے بعد سب سے پہلے شاہ اسمٰعیل نے اپنے احباب
مولوی عبد الحی شاہ محمد اسحٰق شاہ۔ محمد یعقوب۔ مولانا عبد اللہ خاں علوی
حکیم مومن خاں مومن اور مولوی فرید الدین مراد آبادی کے سامنے پیش کی
تھی اور کہا تھا "میں جانتا ہوں کہ اس میں بعض جگہ ذرا تیز الفاظ بھی آ گئے
ہیں اور بعض جگہ تشدد بھی ہو گیا ہے مثلاً ان امور کو جو شرک خفی ہیں شرک
جلی لکھ دیا ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ شورش ضرور پھیلے گی۔" مگر مومن خاں
نے دلداری کے طور پر کہا کہ کوئی ہرج نہیں، ایسے ہی رہنے دیجئے۔
(باغی ہندوستان)۔ اس روایت میں سید صاحب کی بھی موجودگی دکھائی گئی
ہے اور یہ بھی لکھا گیا ہے کہ یہ واقعہ جہاد کی روانگی سے پہلے کا ہے مگر
اس میں مغالطہ ہے اور راوی کی غلطی ہے، سید صاحب کے رائے بریلی
پہنچنے کے بعد اور جہاد کی روانگی سے پہلے دہلی آنے کا کہیں تذکرہ نہیں

ہے[۱]۔ خلافت حاصل کرنے اور تبلیغی دوروں پر روانہ ہونے کے زمانہ کو اگر جہاد کی روانگی سے پہلے کا زمانہ شمار کیا جاسکتا ہے تو بے شک سید صاحب کی موجودگی اس مجمع احباب میں ہوسکتی ہے ورنہ نہیں، واللہ اعلم۔ بہرحال تقویۃ الایمان کی تصنیف کا تعین ۱۲۳۲ھ (۱۸۱۸ء) سے پہلے ہی کیا جاسکتا ہے۔ پھر ۱۲۳۴ھ میں صراط مستقیم وجود میں آئی ہے، گویا صراطِ مستقیم تقویۃ الایمان کی اصلاح شدہ نقل رپٹ ہے اور بالفرض محال صراط مستقیم کے کچھ دن بعد اور جہاد کی روانگی سے پہلے تقویۃ الایمان لکھی گئی ہے تو گویا شاہ اسمٰعیل نے صراط مستقیم کی اصلاح فرمائی ہے اور اپنے مرشد کی تردید کی ہے۔ تقویۃ الایمان سب سے پہلے عربی میں لکھی گئی تھی[۲]۔ اور اس کا اردو میں ترجمہ بعد کو کیا گیا ہے۔ اب اگر تقویۃ الایمان صراط مستقیم کے بعد کی ہوتی تو حجاز میں اس کے عربی نسخہ کی اشاعت میں آسانی ہوتی۔ چہ جائیکہ فارسی میں لکھی ہوئی صراط مستقیم کا ترجمہ عربی میں کرکے تقسیم کیا گیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تقویۃ الایمان کو صراط مستقیم نے منسوخ کر دیا تھا۔ بہرحال حجاز میں سفر حج کے موقع پر صراط مستقیم کا عربی ترجمہ تقسیم کیا گیا تھا اور اس کے اندر موحدانہ عقائد بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ اب وہ کونسی عقل ہے جو اس بات کا یقین کرے کہ صراط مستقیم کے مضامین کو

---

[۱] البتہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ رائے بریلی سے براہ دہلی مالوہ گئے تھے مگر یہ سال اس سال تصنیف سے بہت پہلے کا ہے۔

[۲] شاہ اسمٰعیل کی عربی کتاب ردالاشراک کا ترجمہ تقویۃ الایمان ہے۔

اہلِ حجاز نے اچھی نظروں سے دیکھا اور اس قافلہ کو وہاں مقبولیت حاصل ہوئی۔ البتہ نجدی الخیال طبقہ میں قدر و منزلت کا احتمال و امکان ہے ان حضرات کے بیانات سے خود ظاہر ہے کہ وہاں بیعت کرنے والوں کی تعداد انگلیوں پر شمار ہونے کے لائق ہے۔ بلغار کا ایک عالم مرید ہوا تھا اس سے یہ نہیں سمجھا جا سکتا کہ بلغار کے کل وفد نے بیعت کی۔ جاویوں میں محض تین شخصوں کی بیعت کا اظہار ہے۔ اس کا مطلب بھی یہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ جاوا کے کل قافلہ نے بیعت کر لی وغیرہ۔ لہٰذا یہ کل بیانات زیبِ داستاں ہونے کی حیثیت رکھتے ہیں۔

مدینہ منورہ سے جلد واپسی کا سبب صرف سرد موسم ہی نہیں ہو سکتا بلکہ اس میں مولوی عبدالحق بنوتنبوی کے موحدانہ خیالات کے مقدمہ کا بھی دخل ہے اور سب سے زیادہ یہ کہ وہاں پہنچ کر شاہ اسمٰعیل نے اظہار کیا تھا کہ شدِ رحال کی حدیث کے مطابق تین مسجدوں یعنی مسجدِ حرام، مسجدِ نبوی اور مسجدِ اقصیٰ کا سفر جائز ہے۔ لہٰذا میں صرف مسجدِ نبوی میں نماز پڑھنے کے لئے آیا ہوں۔ رسولِ پاک کے مزار کی زیارت ضمناً حاصل ہو گئی۔ یہ سن کر مدینہ والے چراغ پا ہو گئے اور ان کے درپئے آزار ہو گئے۔ اسی لئے قافلہ کو جلد وہاں سے واپس آنا پڑا۔ (تحفہ محمدیہ ص ۱۲۶) ایسی حالت میں ان حضرات کی واپسی پر بنا اشارۂ حضور رحمۃ اللعالمین صلی اللہ علیہ وسلم مانی جائے تو اس کا کھلا ہوا مطلب ہے کہ وہ خارج البلد کئے گئے تھے۔ کوئی وجہ نہیں کہ مدینہ منورہ میں

مولوی عبد الحیٔ بڈھانوی کے موحدانہ معتقدات کے مقدمے اور شاہ اسمٰعیل کے اعلانِ شدِ رحال کی خبروں نے مکہ معظمہ والوں کے کان نہ کھولے ہوں اور انہوں نے ابتدائی افواہ کو ازسرِ تو صحیح نہ سمجھا ہو۔ مکہ معظمہ کے اس آخری قیام میں نشر و اشاعت اور سلسلہ بیعت کی دھوم کے بجائے سکوت پایا جاتا ہے۔ یہی خلوت گزینی اور اچانک واپسی بتا رہی ہے کہ تیار حج کو چھوڑ دینا معنی دارد کہ در گفتن نمی آید۔ اور اگر واپسی کے لئے فرمانِ الٰہی ہوا تھا تو کھلے ہوئے معنیٰ ہیں کہ تیار حج سے انہیں محروم کرنا تھا اور یہ بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ مکہ والوں کے غصہ اور عتاب سے بچانے کی خاطر دوسرے حج کی سعادت نہیں دی گئی۔ حکم الٰہی ۱۵ شوال کو ہوا تھا اور انہوں نے یکم ذیقعدہ کو حج سے ایک مہینہ پیشتر حجاز کو بادلِ محزوں الوداع کہا تھا۔ پندرہ دن کے اندر اتنے بڑے قافلہ کے لیٔے جہازوں کا مہیا ہو جانا مجبر العقول بات ہے۔ مگر یہ بھی ظاہر کیا گیا ہے کہ مدینہ منورہ کی واپسی کے بعد ہی قافلہ والوں کو جہازوں کی گنجائش کے مطابق بھیجنا شروع کر دیا تھا۔ تو اس صورت میں حکم الٰہی کا تعیّن ۱۵ شوال غلط ہو جاتا ہے آخر یہ راز کیا ہے کہ بات بنائے نہیں بنتی۔ جبلِ رحمت والی دعا کہ قافلے والوں کو حاجی کے لقب سے ملقب نہ کیا جائے، خود اپنے معنی بیان کر رہی ہے۔ جادو، وہ جو سر پہ چڑھ کے بولے اور شاہ اسمٰعیل کی والدہ صاحبہ کی نیّت کے خلاف مرض الموت کے

اندریں مجبوری بیعت بھی کسی تبصرے کی محتاج نہیں۔ کمالات ہیں کہ ذم کے پہلوؤں میں بھی فخر کی شان نمایاں کی جاتی ہے۔ مجھ لیا میرے ساقی نے بدحواس مجھے۔ اس سفر حجاز کے حالات کا مبشرات سے سلسلہ ملانا اور دونوں کی مطابقت کرنا دشوار ہے بادی النظر میں قال حال سے جدا معلوم ہوتا ہے۔ سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۱۹۷ میں علانیہ بتا دیا گیا ہے کہ حج میں رفث فسوق و جدال نہیں ہونا چاہیئے۔ اندریں حالات اس سفر حجاز کو وسیلہ ظفر، شاید ہی کوئی صاحب عقل سمجھے۔ واللہ اعلم بالصواب

اس بے بسی پہ ذوق بشر کا یہ حال ہے
کیا جانے کیا کرے جو خدا اختیار دے

چھٹا باب

جہاد

جہاد ایک نشتر ہے جس سے مادہ فاسد دُور کیا جاتا ہے" تاکہ قوم وملت کی صحت وتندرستی صحیح رہے۔ حکم جہاد سب سے پہلے موسیٰ علیہ السّلام کو دیا گیا تھا کہ اپنی سرکش قوم کو راہِ راست پر لائیں۔ حضرت نبی الامی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جہاد کی شرائط نرم کر دی گئی تھیں جہاد کا مفہوم مخالف کو فنا کرنا نہیں ہے بلکہ اس کی اصلاح کرنا ہے۔ مہاجرین وانصار نے جہاد کر کے جزیرۃ العرب میں اسلام کا پرچم لہرایا شام وعراق میں توحید کا ڈنکا بجایا۔ قیصر وکسریٰ کی سلطنتیں رام کیں اور آخر میں ترکستان۔ سوڈان اور ہندوستان۔ بلادِ اسلامیہ میں شامل کئے گئے۔ یہاں ہندوستان میں سلطان قطب الدین ایبک سے لے کر آخری تاجداران مغلیہ تک کسی نے بھی جہاد کا نام نہیں لیا۔ مرہٹوں نے جب ہاتھ پاؤں نکالے تو شاہ عبدالرحیم نے بذریعہ خط نظام الملک آصف جاہ اوّل کو جہاد کی ترغیب دی تھی مگر اعتنا نہیں کی گئی۔ شاہ ولی اللہ نے مسلمانوں کی ابتری ونکبت دور کرنے کے لئے ایک اصلاحی تحریک کا اجراء کیا تھا جس کا آخری جزء جہاد تھا۔ شاہ عبدالعزیزؒ

نے اس تحریک کو چلایا مگر آخری جز کے متعلق عملی قدم نہ اُٹھا سکے،
البتہ فتوی کے ذریعہ ہندوستان کو دار الحرب قرار دیا تھا اور جہاد کا
دروازہ کھول دیا تھا۔ پھر اپنے عربی منظوم خطوط میں جو اپنے چچا کو
لکھے تھے سکھوں کے مظالم سے بیزاری کا اظہار کر کے جہاد کی سمت
بھی بتادی تھی۔ رنجیت سنگھ کے مظالم سے پہلے شاہ ولی اللہ رح اپنی
کتاب "خیر کثیر" ص ۱۱۳ میں لکھ چکے تھے کہ حکومت چلانے کی استعداد
مسلمانان ہند سے افاغنہ کی طرف منتقل ہو چکی ہے۔ مدعا یہ کہ افغانوں
کی مدد سے ترقی کی راہ نکل سکتی ہے چنانچہ شاہ عبد العزیز رح نے
مولانا عبد الحی اور شاہ اسمٰعیل کے سید احمد صاحب سے بیعت
ہو جانے کے بعد ان تینوں کو ہدایت دی کہ تبلیغ کے لئے دورہ کریں
در پردہ مدعا یہ تھا کہ جب میدان تیار ہو جائے تو جہاد کریں۔ اس
اتحاد ثلاثہ کا تعلق شاہ صاحب سے فریضہ حج کی ادائیگی تک رہا
مگر ان کی واپسی تک ان کا وصال ہو گیا تھا۔ تاریخ وصال مومن خاں
نے لاجواب لکھی تھی۔

دست بیداد اجل سے بے سر و پا ہو گئے
فقر و دیں، فضل و ہنر، لطف و کرم، علم و ادب
۲۹ شعبان ۱۲۳۹ھ ۱۸۲۴ء

کہا جاتا ہے کہ بیعت کرنے سے پہلے سکھوں سے جہاد کرنے
کا خیال شاہ اسمٰعیل کو ہوا تھا۔ تفتیش احوال کے لئے انہوں نے

پنجاب کا خفیہ دورہ بھی کیا تھا۔ پھر بیعت کرنے کے بعد وہ سید صاحب کی خدمت میں رہنے لگے اور جہاد کا خیال محو ہو گیا۔ دورے کے دوران میں بمقام رام پور کسی افغانی نے سکھوں کے مظالم کی داستان مسلمانوں کے متعلق سنائی تو جہاد کا خیال پھر جاگ اُٹھا۔ جہاد کے لیئے بیعت بھی لی جانے لگی اور پوری تیاری ہوتے ہی بجائے جہاد کے حج کرنے کو چل دیئے۔ واپس آکر دوبارہ جہاد کا اعلان کیا اور سرحد پہنچ گئے۔

دشمنوں کا ذکر نہیں، دوستوں میں بھی کوئی ایسا متنفس نہیں جس کو اس جہاد کی ناکامی کا اقرار نہ ہو۔ احباب و سوانح نگار آنسو بہاتے ہیں مگر ناکامی کے اسباب پر توجہ نہیں کرتے۔ کوئی اگر خامیوں کی طرف اشارہ بھی کرتا ہے تو مطعون کر دیا جاتا ہے۔ تاویلوں سے کام لے کر ادھر اُدھر کی لاطائل بحث کی جاتی ہے اور نہیں سمجھنے کی کوشش کرتے کہ قافلہ کیسے لٹا۔ اس جہاد کی امتیازی خصوصیت پر فخر ہے کہ زبان۔ قلم اور سناں سے جہاد کیا گیا تھا مگر انہیں خصوصیات میں ناکامی و شرمندگی کا راز بھی بند ہے۔ قلمی کارنامے شہادت دے رہے ہیں کہ افتراق بین المسلمین کا زہریلا تخم بو دیا تقویۃ الایمان نے اتحاد کا راستہ بند کر دیا اور صراط مستقیم نے دُور باش کا نعرہ لگایا۔ خلافِ فطرت یہ تخیل جمایا کہ دنیا بھر کو اپنا ہمخیال بنائیں گے۔ دعوت نامے اور خطوط بے اثر ثابت ہوئے۔ زبان کی سحر آفرینی عجائب پرستی میں منتقل ہو گئی، توحید کا سبق پڑھاتے پڑھاتے شخصیت کے قصیدے پڑھے جانے لگے۔ کرامتوں کی تاثیر نے عقل و شعور کو رخصت

کر دیا۔ اندھی تقلید اور شخصیت پرستی نے شریعت و طریقت کا مقصد بھلا دیا۔ پندار نے آگ لگا دی۔ خودی و نفس نے خاک اڑا دی۔ جہاد میں نوکِ سنان ترچھی پڑ گئی۔ ارادت مند جس مقبولیت کے مدعی ہیں، اس کی تصدیق ان کے تذکرے کسی نوعیت سے نہیں کرتے۔ آخر سے ابتدا کا سلسلہ نہیں ملتا اور اب تو کہا جا سکتا ہے کہ ابتدا اور آخر دونوں غلط تھے۔ آنکھ کو چاہیئے، ہر رنگ میں وا ہو جانا۔

یہ بحث کہ جہاد کا رُخ سکھوں کی طرف تھا۔ انگریزوں کی جانب تھا یا دونوں کی سمت تھا بے حد اہم اور مایۂ ناز سمجھی جاتی ہے۔ بیشک سید صاحب کی یہ کرامت ہے کہ ہر سہ خیال کی تصدیق ہو جاتی ہے۔ مگر یہ جملہ شہادتیں اور بیانات مختلف مواقع و محل کے ہیں۔ اس لئے متضاد نہیں سمجھے جا سکتے۔ ظاہر ہے کہ سکھوں سے علانیہ جہاد کیا تھا مگر خطوط میں موجود ہے کہ وہ نصاریٰ سے بھی جہاد کرنا چاہتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ ہندوستان ہی کو نہیں بلکہ کابل۔ ایران۔ ترکستان۔ خراسان اور چین کو بھی کفر سے پاک کرنا چاہتے تھے مگر بہ یک وقت دنیا بھر سے لڑائی مول نہیں لی جا سکتی تھی۔ اگر توفیق الٰہی شاملِ حال ہوتی تو سکھوں کے بعد ان سب سے جہاد کرتے چونکہ منشا الٰہی نہیں تھا انہیں قدم اول پر سکھوں کے مقابل میں ناکامی ہوئی۔ اس لئے یاروں نے تسلی اور اشک شوئی کے لئے اسی مسئلہ کو اہمیت دے دی کہ وہ جہاد کس سے کرنا چاہتے تھے۔

اس بحث کی بنیاد یوں پڑی کہ پہلے والوں نے اپنے حالات کے مطابق

مفہوم سمجھا اور بعد والوں نے اپنے معیار کے مطابق قیاس کیا پہلے انگریز کی زمانہ سازی بے طرح سر سہلا کر تسلی دیا کرتی تھی۔ اس لئے انگریز کو بے زور یا سمجھا۔ اور اب جب اس نے بھیجہ کھالیا اور مغز نہیں رہا تو اس کی تھپکیاں سنگ و خشت معلوم ہونے لگیں۔ اس کے نام سے نفرت ہو گئی اور اتنی گالیاں دی گئیں کہ وہ خود ہندوستان کو چھوڑ بھاگا۔ مگر اس بحث کا حاصل کیا؟ کوئی فریق جیت بھی جائے تو اسے کئے رکعت کا ثواب ملے گا۔ آں قدح بشکست و آں ساقی نماند

اس زمانہ میں جبکہ سید صاحب جہاد کے لئے روانہ ہوئے۔ سکھ بارک زئیوں کی لڑائیوں کی وجہ سے پریشان و خستہ تھے اور رنجیت سنگھ خود امرتسر میں بیمار پڑا ہوا تھا۔ چونکہ سکھ عضوِ ضعیف تھے لہٰذا سید صاحب کا نزلہ عضوِ ضعیف پر ہی گرتا تھا۔ انگریز خود خائف و لرزاں تھا کہ سید صاحب کی آندھی کا رُخ اس کی طرف نہ ہو جائے۔ اس لئے ہر موقع پر اس نے اس جماعت کی کاسہ لیسی کی، خود دعوتیں کیں، اپنی مدخولہ مسلمان عورتوں کو مرید کروایا، ہر طرح سے تحفے اور نذرانے دیئے اور دلوائے ممکن ہے کہ سیاسی اونچ نیچ بھی سمجھائی ہو۔ کلکتہ میں اپنے یہاں بلا کر شاہ اسمٰعیل کا وعظ سُنا۔ یہ بھی یقین دلوایا کہ ہم مانع جہاد نہیں بشرطیکہ ہماری عملداری میں فتنہ و فساد واقع نہ ہو۔ اپنے ملازمین کو شرکت جہاد کی اجازت دی اور سید صاحب کو دہلی سے بھیجی ہوئی غائب شدہ ہنڈی بھی بذریعہ عدالت

ا؎ قندھار۔ غزنی۔ کابل۔ پشاور۔ کوہاٹ اور ہشت نگر میں بارک زئیوں کی حکومت محدود تھی۔

جفا کاران سے دلوائی - ان تمام امور کی موجودگی میں سیّد صاحب کا اخلاقی فرض تھا کہ احسان کا بدلہ احسان سے دیں - اسی لئے سیّد صاحب نے اعلان کیا کہ ہمیں فی الحال انگریزوں سے لڑنا نہیں ہے اور شاہ اسمٰعیل نے یہاں تک وسعت اخلاق دکھائی کہ جو انگریز کا دشمن ہے اس کے ہم دشمن ہیں - اس اخلاقی سلوک کو سازش یا طرفداری سمجھنا غلطی ہے - انگریز کے اخلاق نے رنجیت سنگھ کو بھی اپنا گرویدہ بنا لیا تھا - اس کے دونوں میٹھے تھے - اس نے قلوب اور حکومتوں کی تسخیر حسب مراد کی -

انگریز کے اس اعلان کے کہ ہم مانع جہاد نہیں معنی واضح کر دیئے جاتے تو یہ مسئلہ نزاعی نہ بنتا اور بحث وجود میں نہ آتی کہ سیّد صاحب نے بجائے دہلی کی سمت سے حملہ کرنے کے سندھ کی راہ دراز کیوں اختیار کی - ۱۸۰۹ء میں انگریزوں اور سکھوں سے معاہدہ ہوا تھا کہ دونوں کے درمیان دریائے ستلج حدِ فاصل رہے گا اور حدِ فاصل کے پار کسی فریق کو دخل دینے کا حق نہیں ہوگا - اب اگر دہلی کی طرف سے حملہ کیا جاتا تو معاہدہ میں رخنہ پڑتا اور فساد برپا ہوتا - ایسی حالت میں مجاہدین انگریزوں اور سکھوں کے درمیان پس کر رہ جاتے اور ان بے سر و سامان مٹھی بھر غازیوں کی اتنی ہمت کہاں تھی کہ دو سے مقابلہ کر سکتے بس اسی مصلحت و مجبوری کو انگریز نے ان کے ذہن نشین کر دیا تھا ورنہ وہ سندھ کی راہ دراز کبھی ہرگز اختیار نہ کرتے اور اس میں فائدہ کی یہ صورت بھی تھی کہ جہاد کی تبلیغ وسیع پیمانہ پر ہو سکے گی - اُدھر کی

اسلامی حکومتوں سے مدد مل سکے گی اور سب سے زیادہ یہ کہ افغانی سکھوں سے بیزار ہونے کی وجہ سے ان مجاہدین کو فرشتۂ رحمت سمجھ کر سر آنکھوں پر بٹھائیں گے۔ ان کی پیر پرستی اور ملاؤں کی غلامی کی عادت سید صاحب کی مقبولیت میں چار چاند لگائے گی۔ اس حقیقت کے سمجھنے کے بعد راہ دراز کے متعلق بحث کرنے کی ضرورت نہیں رہتی یہ کہ نتیجہ خلاف اُمید نکلا، اس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ ان حضرات میں ملاؤں کی طرح لچک نہیں تھی کہ سب کو خوش رکھ سکیں بلکہ ایک قسم کا اکھڑپن تھا جس کو کوئی بھی پسند نہیں کر سکتا تھا۔

اس جہاد کی ناکامی پر یہ سمجھ کر مطمئن ہو جانا کافی نہیں ہے کہ تقدیری معاملہ تھا۔ منافقت سے سابقہ پڑا یا حالات سرحد سے ہم واقف نہیں تھے۔ تذکرہ نگاروں نے محض مرثیہ لکھا ہے اور اصل وجوہات کو سمجھنے کی طرف توجہ نہیں کی ہے۔ البتہ مولوی محمد جعفر تھانیسری قابل مبارکباد ہیں کہ نوحہ پڑھنے کے ساتھ نقائص پر بھی غور کرنے کی ضرورت سمجھی۔ بغیر حیلہ و تاویل سے کام لئے ہوئے تدین و جراُت کے ساتھ اُنھوں نے لکھ دیا کہ "الہام ظنی چیز ہے۔ فتح پنجاب کا الہام غلط نکلا...... بوجہ اپنی پاک باطنی کے اس بے نظیر بزرگ کو پولیٹکل پیچیدگیوں اور فن جنگ کی طرف بالکل توجہ نہیں تھی۔ انہیں دو نقصوں نے اس کے بنے کام کو بگاڑ کر آخر اس کو بالاکوٹ میں وہ دن دکھایا جس کی یاد سے دِل دکھتے ہیں"۔ بعد والے تذکرہ نویسوں

اور ارادتمندوں کو یہ بیان شاق ہُوا اور ہے اور دعویٰ کرتے ہیں کہ سید صاحب کو سیاست آتی تھی اور فن جنگ کے ماہر پیدائشی طور پر تھے۔ اس بیان سے سید صاحب کی تنقیص ضرور ہو جاتی ہے مگر ناکامی کا کسی نہ کسی طرح نقص تو تسلیم کرنا ہی پڑے گا مگر قیامت یہ ہے کہ بہتر صورت سے بھی کوئی توجیہہ کرنے کی ہمت نہیں کرتا۔ اگر واقعی غور کیا جائے تو پانی اس جگہ مرتا ہے کہ شاہ عبدالعزیزؒ کے بنائے ہوئے اتحادِ ثلاثہ میں اتحاد نہ تھا۔ تینوں میں سے ہر ایک کی فطرت و طبیعت جُدا تھی۔ باوجود خلوصِ نیت، وحدتِ مقصد اور پختگی عقیدت آپس میں ہم خیالی نہ پیدا ہو سکی۔ سید صاحب کا علم کشف و شہود پر مبنی تھا اور شاہ اسمٰعیل و مولانا عبدالحی اہل مدرسہ ہونے کی وجہ سے علم قیل و قال میں یگانۂ روزگار تھے۔ انہوں نے سید صاحب کی رُوحانیت کا ترجمہ مادی زبان میں منطق و فلسفہ کے اصول پر کیا۔ جس علم و فضل نے شاہ اسمٰعیل کو تقلید کا منکر بنایا تھا۔ اسی علم و فضل نے مولوی عبدالحی کو تقلید پہ قائم رکھا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ شاہ اسمٰعیل خود رائے اور دریدہ دہن تھے اور مولوی عبدالحی باادب اور متین تھے۔ ان حضرات میں اعتدال و اتصال اس وجہ سے بھی نہ ہو سکا کہ یہ شریعت و طریقت کو دو مختلف شے سمجھتے تھے۔ اگر یہ شریعت و طریقت کے ربط کے قائل ہوتے تو یہ بیگانہ روشی کبھی وجود میں نہ آتی اور دو عملی سے بچ جاتے، یہ عذر کہ سرحد کے حالات سے واقف

نہ تھے۔ اگر صحیح مان لیا جائے تو علمیت و ولایت کی دھجیاں اُڑی جاتی ہیں۔ ایسی حالت میں کیا ضرور تھا کہ وُہ سرحد تشریف لے جاتے۔

یہ بھی ایک علانیہ فطری کرامت ہے کہ اس جہاد کے متعلق مجاہدین اُور سکھوں کے بیانات ایک ہی میدان میں جمع نہیں ہو سکتے۔ دونوں کی روایتوں میں زمین و آسمان کا اختلاف ہے۔ سکھ اس جہاد کو پرِکاہ کی برابر بھی اہمیت نہیں دیتے اُور مجاہدین کی زبان اس کی مدحت میں سوکھی جاتی ہے جنگ اکوڑہ کے متعلق دونوں اپنی اپنی کہتے ہیں اُور نہیں کہا جا سکتا کہ کس کی روایت صحیح ہے۔

وُہ کہتے ہیں کہ بدھ سنگھ کو شاندار کامیابی ہوئی۔ مجاہدین کا دعویٰ ہے کہ ہم نے بڑی طرح سکھوں کو شکست دی۔ وہ کہتے ہیں کہ مجاہدین کا نقصان کثیر ہُوا۔ یہ کہتے ہیں کہ سکھ اس قدر مارے گئے کہ انہیں میدان چھوڑنا پڑا اُور ہمارے ۳۶ یا ۳۷ غازی شہید ہوئے اُور تقریباً اتنے ہی زخمی ہوئے۔ وہ کہتے ہیں کہ جعلی حکم نامہ دکھا کر قلعہ گوبند گڑھ پر قبضہ کرنے کی وجہ سے رنجیت سنگھ، بدھ سنگھ سے بے حد ناراض تھا اُور اس کو سزا دینے کی فکر میں تھا مگر اکوڑہ کی کامیابی پر اس کا قصور معاف کر دیا گیا۔ وہ یہ بھی اقرار کرتے ہیں کہ اکوڑہ فتح کر کے جب ہم جہانگیرہ پہنچے تو غازیوں نے ہمیں محصور کر لیا، لیکن جب رسد ختم ہو گئی تو بدھ سنگھ مورچوں سے باہر نکلا اُور بڑی خون ریزی کے بعد اس نے غازیوں کے منہ پھیر دیئے اُور انہیں پیٹھ دکھا کر بھاگتے ہی بنی۔ یہاں سے بھاگ کر مجاہدین

نے یوسف زئی کی پہاڑیوں میں جاکر پناہ لی اور عرصہ دراز تک سر نہ اُٹھا سکے۔ یہ کہتے ہیں کہ اکوڑہ میں شکست کھاکر بُدھ سنگھ نے اپنے سراسیمہ لشکر کو جمع کیا اور پیچھے سے حملہ کیا، مگر مجاہدین خارہ بندی سے بخیر و خوبی باہر نکل آئے اور سکھ ان کا تعاقب نہ کر سکے۔ مجاہدین کے تذکرہ نویسوں کا دعویٰ یہ ہے کہ یہ جنگ بدر کے یوم الفرقان کی طرح لیلۃ الفرقان تھی۔ مزید بیان دیا ہے کہ بدھ سنگھ لاہور کی طرف بھاگا جا رہا تھا مگر اٹک کے قلعدار نے اسے باز رکھا کہ میدان خالی پاکر خلیفہ کا لشکر خیرآباد اور اٹک پہنچ کر اس ملک کو اپنے قبضہ و تصرف میں کرے گا۔ اگرچہ مسلمانوں کے نامی شجاع اس جنگ میں کام آئے مگر فتح سے مجاہدین کی شہرت تمام ملک میں پھیل گئی اور مجاہدین کی تعداد میں پانچ ہزار تک اضافہ ہوا۔ فریقین کے یہ بیانات ویسے ہی ہیں جیسے کہ ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم کے وقت حضرت اکبر الٰہ آبادی نے لکھا تھا کہ :-

فتح برٹش کی ہوتی ہے قدم جرمن کا بڑھتا ہے۔

سکھوں کی تاریخ برملا اعلان کر رہی ہے کہ "سید احمد کے چند مذہبی دیوانوں نے یہاں کی پہاڑیوں کی رنگ برنگ جماعتوں کی سرداری کر کے ہل چل ڈال دی تھی۔ مگر ان کا سخت جوش پھونس کی آگ کی طرح کا تھا کہ ذرا سی دیر میں شعلہ ختم ہو جاتا تھا۔ ان لوگوں میں صرف بگاڑنے کی قابلیت تھی۔ بنانے کی قابلیت نہیں تھی۔ نتیجہ آخر یہ ہوا کہ سکھوں کو فتح ہوئی۔ سکھوں کا بیان صحیح ہو یا غلط مگر انہوں نے بالکل صحیح اندازہ

کیا کہ ان میں بگاڑنے کی قابلیت تھی اور بنانے کی اہلیت نہیں تھی۔ سید صاحب کے مداح اس سے انکار نہیں کر سکتے۔

قیاس کن ز گلستان من بہار مرا

اس جہاد کی صحیح حقیقت اس وقت منکشف ہو سکتی ہے جبکہ راویوں اور تذکرہ نویسوں کی عقیدت مندی۔ قصیدہ گوئی۔ مرثیہ خوانی اور علمی تاویلوں کو صرفِ نظر کرکے محض واقعات کو ملاحظہ کیا جائے اور خود اپنی ذاتی رائے قائم کی جائے، اس لئے مناسب ہے کہ واقعات پر طائرانہ نظر ڈال لی جائے۔

یہ صحیح ہے کہ ان حضرات نے جہاد کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی، مگر سوال یہ ہے کہ یہ اہل بھی تھے یا نہیں۔ بالفرض یہ اہل تھے مگر ان کا طرزِ عمل صحیح نہیں تھا۔ جہاد کے لئے امیر کا انتخاب ضروری ہے اور انہوں نے اعلان جہاد کے ساتھ امیر کا انتخاب نہیں کیا جب اعتراض کیا گیا تو بتایا کہ سید صاحب مامور من اللہ ہیں، اس لئے انتخاب کی ضرورت نہیں۔ مامور من اللہ کی کچھ خصوصیات ہوتی ہیں۔ ایک علامت یہ ہے کہ اس کا الہام غلطی سے مبرّیٰ ہو۔ واسطی نہج تک اگر جائزہ لیا جائے تو سید صاحب کے اکثر الہامات کو غلطی سے بری ہونے کی سعادت حاصل نہیں ہے۔ بالفرض اس دعویٰ کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو سرحد پہنچ کر مامور من اللہ کو انتخاب کے ذریعہ سے امیر بنانے کی ضرورت کیا تھی۔ یہ تو خود دعویٰ کی تکذیب

ہے - بہر حال کچھ ہی سہی ان کی نیت نیک تھی - ان کا جذبہ صحیح تھا اب بات حسنِ قابلیت اور مآل اندیشی کی رہ جاتی ہے - مگر اس کے متعلق بھی ان کا تذبذب و تلوّن صحیح نتیجہ پر نہیں پہنچنے دیتا. قصہ یوں شروع ہوتا ہے کہ ۱۲۳۹ھ میں حج سے واپس آکر مراقبہ و توجہ فرمائی کو خیرباد کہہ کر سپہ گری کی مشق کروائی جانے لگی اور مولوی عبدالحی و شاہ اسمٰعیل کو ترغیب جہاد کے لئے اطراف ہندوستان میں بھیجا گیا۔ شاہ عبدالعزیز کے انتقال کے بعد بسلسلہ تعزیت ۱۲۴۰ھ میں دہلی پہنچ کر مولوی عبدالحی نے جامع مسجد میں وعظ فرمایا۔ اسی موقعہ پر تقویۃ الایمان کے خلاف شاہ رفیع الدین کے صاحبزادگان مولوی مخصوص اللہ و مولوی موسیٰ۔ شاہ عبدالعزیز کے شاگرد رشید مولوی رشید الدین خاں۔ مولوی محمد شریف مولوی عبداللہ۔ آخون شیر محمد اور مولوی فضل الحق خیرآبادی وغیرہ کا دستخطی استفتاء ان کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ طویل بحث کے بعد مولوی عبدالحی نے اس پر دستخط کر دیئے اور شاہ اسمٰعیل سوءِ مزاجی کا اظہار کر کے دہلی سے چل دیئے۔ یہ دیکھ کر بہت سے معتقدین تائب ہو کر ان سے علیحدہ ہو گئے[۱]۔ یہی وجہ ہے کہ مجاہدین کی فہرست میں دہلی والوں کا نام خال خال ہے۔ یہاں کے علما کی کثیر جماعت جب مخالف ہو گئی تو ان حضرات کی مقبولیت اتنی نہیں سمجھی جا سکتی جتنی کہ ظاہر کی گئی ہے۔ بتایا گیا ہے کہ معتقدین کی تعداد ہندوستان میں لاکھوں تک پہنچ گئی تھی مگر جہاد میں شرکت کے لئے معدودے چند لوگ ہی آئے۔ ۱۷ر جنوری

---

[۱] منقول از سیف الجبار مصنفہ مولوی فضل رسول بدایونی

سنہ ۱۸۲۶ء مطابق ۷ جمادی الثانی سنہ ۱۲۴۱ھ کو جہاد کے لئے وطن سے کوچ کیا
بقول سوانح احمدی دو ہزار اور بقول دیگر تذکرہ جات چار سو سے ساڑھے
چھ سو تک مجاہدین کی جمعیت تھی۔ سفرِ حج میں الہام ربانی ہوا تھا کہ پشاور
سے تا دریائے ستلج ہندوستان کی طرح تمہارے ہاتھوں یہ ملک رشک
افزائے چمن ہوگا اور بروایت وزیرالدولہ وسید محمد یعقوب وقت رخصت
جہاد اپنی ہمشیرہ سے فرمایا تھا کہ جب تک ہند کا شرک ایران کا رفض،
چین کا کفر اور افغانستان کا نفاق میرے ہاتھ سے محو ہو کر ہر مردہ سنت
زندہ نہ ہوئے گی، اللہ رب العزت مجھ کو نہیں اُٹھائے گا۔ اگر قبل از
ظہور ان واقعات کے کوئی شخص میری موت کی خبر دے اور تصدیق خبر
پر حلف بھی کرے کہ سید احمد میرے روبرو مر گیا یا مارا گیا کہ تم اس قول
پہ ہرگز اعتبار نہ کرنا کیونکہ میرے رب نے مجھ سے وعدۂ واثق کیا ہے
کہ ان چیزوں کو میرے ہاتھ پر پورا کر کے مجھے مارے گا۔[1]

بعد میں اکثر مواقع پر تحریر و تقریر میں اسی کی توثیق فرمائی ہے کہ فقیر
دریں باب باشارات غیبی مامور است و باشاراتِ لاریبی بشر۔ ہرگز
ہرگز شبہ و وسوسۂ شیطانی و شائبہ ہوائے نفسانی باین الہام ممتزج
نیست۔

رائے بریلی سے روانہ ہو کر مختلف مقامات پر ٹھیرتے ہوئے ٹونک
میں تشریف فرما ہوئے۔ نواب امیر خاں کو بیعت سے مشرف فرمایا اور

---

[1] سوانح احمدی یعنی تواریخ عجیبہ صفحہ ۹۲ و صفحہ ۲۴۲ ... وزیرالدولہ نے بھی تصدیق کی ہے
اور چھوٹی اہلیہ سے بھی یہی فرمایا تھا۔

ایک مہینہ یہاں قیام کیا۔ "سیف الجبار" میں ٹونک کا ایک واقعہ درج ہے۔ سیّد صاحب کے خادم میاں الطاف پر وحی آتی تھی۔ کیفیت طاری ہونے پر اہلِ مجلس کو اپنی چادر سے نکال کر بہشتی میوے تقسیم کیا کرتے تھے۔ شاہ اسمٰعیل نے بڑے طمطراق سے سیّد صاحب کے مناقب میں بیان کیا ہے کہ سیّد صاحب کی توجہ سے میاں الطاف کو یہ مرتبہ حاصل ہوا ہے۔ چند رفیقوں اور خصوصاً سیّد صاحب کے بھانجے سیّد حمید الدین کو یہ لغویت ناگوار تھی۔ ایک روز سیّد حمید الدین کے حصّہ میں ایک چھوارہ آیا تو اس میں کیڑا تھا۔ انہوں نے طنز کے ساتھ اہلِ محفل کو دکھایا کہ بہشتی میوہ میں بھی کیڑے ہوتے ہیں۔ سیّد صاحب نے اس بات پر عتاب فرمایا۔ وہ جلے ہوئے تھے، اگلی مرتبہ سیّد حمید الدین نے چادر گھسیٹ کر میاں الطاف کو ننگا کر دیا تو کرامت کھلی کہ رانوں کے بیچ میں میوے کی تھیلی رکھی ہوئی تھی۔ وہ خبیث ذلیل و خوار ہوا۔ "سیف الجبار" کی اشاعت تک میاں الطاف بقیدِ حیات تھے، اب سوائے اس کے اور کیا کہا جائے کہ کجا ماند مسلمانی[1]

نواب وزیر الدولہ رقمطراز ہیں کہ "میں ٹونک سے اجمیر تک ہمرکاب تھا۔ اس سفر میں بارہا اتفاق ہوا۔ ...... میں دیکھا کرتا تھا کہ کبھی سیّد صاحب ایک طرف کو مخاطب ہو کر سلام علیک کرتے اور کبھی سلام کا جواب دیتے یا کسی کے سوال کا جواب دیتے ہوئے معلوم ہوتے۔ ظاہر ہے یہ

---

[1] ایک کتاب میں یہی واقعہ میرٹھ کا لکھا ہے مگر سیّد صاحب سفرِ حجاز سے پہلے غالباً میرٹھ نہیں گئے تھے اور نہ شاید بعد میں گئے۔

سلام اور سوال و جواب رجال الغیب یا ارواح یا اجنّا سے ہوتا تھا کیونکہ آپ فرمایا کرتے تھے کہ ایک گروہ رجال الغیب کا خداوند تعالےٰ کی طرف سے سفر و حضر میں میرے ساتھ رہتا ہے اس گروہ کا عجیب حال ہے جس ملک یا شہر میں ترویج ہدایت باری تعالیٰ کا ارادہ ہوتا ہے تو یہ جماعت قدسیہ بہت کثرت سے وہاں جمع ہو جاتی ہے اور جس جگہ ربّ العزت کو ہدایت کرنا کم ہوتی ہے تو جماعت قدسیہ بہت کم جمع ہوتی ہے۔ دوسرا حال اس جماعت قدسیہ کا یہ ہے کہ ہمارے مقام کے وقت یہ جماعت ہمارے لشکر سے فاصلہ پر اُترتی ہے اور جب ارادۂ الٰہی ہمارے کسی طرف کوچ کرنے کا ہوتا ہے تو یہ جماعت اسی طرف کو چلنے لگتی ہے تب اُن کی روانگی کو دیکھ کر میں خود بخود اس طرف کو چل پڑتا ہوں اور یہی وجہ تھی کہ سیّد صاحب بعض جگہ مہینوں ٹھیرے رہتے تھے اور پھر یک بیک چل دیتے تھے۔

یک ذرہ نیست ہمچو حنا۔ اختیار ما
در دست دیگیست سکون و قرار ما"

یہ نواب وزیر الدولہ کا چشم دید واقعہ ہے اور اس کی تشریح خود سیّد صاحب سے سُنی ہے۔ اس میں کسی کو بھی شک اور اعتراض کی گنجائش نہیں، مگر اس سے معلوم ہوا کہ جہاد کی روانگی سے پہلے سیّد صاحب کو جو علم ہوتا تھا وہ بذریعہ الہام ہوتا تھا یا اللہ جل شانہٗ خود کلام فرماتا

تھا اور ہاتھ پکڑ کر گفتگو کرتا تھا مگر اب دوران جہاد میں یہ علم بذریعہ رجال الغیب حاصل ہونے لگا تھا اور وہ بھی سفر و حضر میں ساتھ رہا کرتے تھے گو کلام نہیں کرتے تھے بلکہ ان کے حرکات و سکنات سے مفہوم سمجھ لیا جاتا تھا۔ اب یہ اہل نظر ہی بتا سکتے ہیں کہ حصول علم کا پہلا طریقہ افضل تھا یا یہ آخری رجال الغیب والا۔ بہر حال اس کو ترقی سے اگر تعبیر نہیں کیا جاسکتا تو اس آخری طریقہ میں تنوع ضرور ہے اور یہ بھی ترقی کی ایک شکل ہے

جب منزل بہ منزل قندھار پہنچے تو نواب بہاولپور اور امیران سندھ کی بے اعتنائی کا بدلہ پورا ہوگیا۔ یہاں کا بچہ بچہ جان قربان کرنے کو تیار تھا۔ فتنہ کا خیال کرکے اور سمجھ کر کہ بستی ویران ہوجائے گی، حاکم قندہار نے ادب کے ساتھ گذارش کی کہ یہاں سے جلد از جلد تشریف لے جائیے ورنہ قانونی کارروائی کرنی پڑے گی اور قندہاریوں کو ساتھ نہ لے جانا۔ سید صاحب نے حکم کی تعمیل کی مگر باوجود منع کرنے کے دو سو ستر قندہاری ان کے ہمراہ ہوگئے۔

کابل میں ۴۵ دن قیام رہا۔ امرار کابل کا اختلاف دور کرنے کی بے انتہا کوشش کی مگر نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ چاہتے تھے کہ کابلیوں کو جہاد کے لئے آمادہ کریں اور یہاں والوں میں خود بھی جہاد کا شوق تھا مگر قدوسی جماعت کی قلت و بے سرو سامانی دیکھ کر ان کے قلوب افسردہ ہوگئے۔ کابلیوں کا حمایت پر آمادہ نہ ہونا فال نیک نہیں ہو سکتا۔ ان کے اتحاد نہ ہونے کی وجہ یہ بھی تھی کہ کابلی حنفی فقہ

کے قائل تھے اور مجاہدین کا عمل نجدی و یمنی طریقوں پر تھا۔ اگرچہ سیّد صاحب نے یقین دلایا کہ وہ حنفی فقہ کے پابند ہیں۔

غرض دس مہینے کے سفر کے بعد جب چارسدہ (ہشت نگر) میں قدم رنجہ فرمایا تو وہاں والوں نے جوش کے ساتھ استقبال کیا۔ تبرّک سمجھ کر سیّد صاحب کے اُونٹ کی زین پوش کا تار تار کھینچ لیا۔ اُونٹ کی دُم کے بال توڑ لئے اور اس کے قدموں کے نیچے کی خاک سینہ و پیشانی پر لگائی (گویا یہاں کے لوگ مشرکانہ رسوم کو عین ایمان سمجھتے تھے (سیّد صاحب معترض نہیں ہوئے)

۲۰ جمادی الاوّل سنہ ۱۲۴۲ھ ۲۱ دسمبر سنہ ۱۸۲۶ء کو جہاد کی بسم اللہ اکوڑے کے شب خون سے ہوئی اس کے بعد سب سے پہلے خادی خاں سردار ہنڈ[1] پھر اشرف خاں رئیس زیدہ نے بیعتِ جہاد کی۔ پھر تو پلک جھپکتے مجاہدین کی تعداد پانچ ہزار ہو گئی۔ خادی خاں کی درخواست پر ہنڈ کو اپنا مرکز بنایا اب ہنڈ والوں نے مشورہ دیا کہ حضرو کے بازار کو لوٹ لیا جائے۔ سیّد صاحب نے جواب دیا کہ اکوڑے میں ہمارے بہت سے غازی شہید و مجروح ہو گئے ہیں (یعنی ۳۶ یا ۳۷) اس لئے ہم معذور ہیں۔ پھر ہمارے ساتھی یہاں کے نشیب و فراز سے بھی واقف نہیں ہیں۔ البتہ تم لوگوں کو اجازت ہے۔ چنانچہ ملکیوں نے چھیالیس قندھاریوں کے ساتھ چھاپہ مارا، جب صبح ہوئی تو ملکی مال لے کر واپس آرہے تھے اور قندھاری

---

[1] سلطان محمود غزنوی نے سنہ ۳۹۱ھ جے پال والئے لاہور کو ہنڈ کے مقام پر شکست دی تھی۔

مال کے لئے ان کا تعاقب کر رہے تھے۔ دریا کے نالہ تک پہنچے تھے کہ پانچسو سکھ آ گئے ملکی فیصلہ نہ کر سکے کہ لڑیں یا مال کو بچائیں۔ سراسیمگی میں جانیں بھی گئیں اور پورا مال بھی نہ بچ سکا۔ جب ان کو بچانے کے لئے مدد بھیجی جس میں بلا اجازت پچاس ہندوستانی غازی بھی شریک ہو گئے تھے تو ان کی صورت دیکھ کر سکھوں نے راہ فرار اختیار کی۔ بچے ہوئے مال کی تقسیم پر ملکی کسی طرح راضی نہیں ہوئے اور شرعی تقسیم کو نہیں مانا۔ گویا بیعت جہاد بے اثر نکلی۔ اس قسم کی خامیاں دیکھ کر پھر غور و خوض کے بعد نظم جمعیۃ کی خاطر ۱۲ جمادی الثانی ۱۲۴۳ھ ۱۸۲۷ء کو ہنڈ کے تالاب کے کنارے سید صاحب امیر منتخب کئے گئے۔

یہ امارت محض تنظیم جہاد کے لئے تھی۔ ریاستوں کے انتظام سے اس کو کوئی تعلق نہ تھا۔ میدان جہاد سے نکل کر ہر مجاہد آزاد تھا۔ یہ امارت باہمی اختلافات ختم کرنے کے لئے تھی مگر بر وقت امارت کے اندر مختلف قسم کے اختلافات نے پرورش پائی اور آخر میں رنگ لائے۔ اب فتح خاں رئیس پنجتار نے بیعت امارت کی اور سلطان محمد خاں اور دیگر روسائے پشاور نے بھی بذریعہ خط بیعت امامت قبول کی۔ سید صاحب کو اسی وقت بتا دیا گیا کہ پشاور والے قابل اعتماد نہیں ہیں۔ حالانکہ کابل کے سفر و قیام میں سید صاحب کو خود اسی حقیقت کا علم ہو چکا تھا بہرحال دو ماہ کے اندر دو لاکھ مجاہدین مہیا ہو گئے۔ لہٰذا کوئی وجہ نہ تھی کہ نوشہرہ جا کر سکھوں پر حملہ نہ کیا جاتا۔ چنانچہ شیدو کے مقام پر جنگ ہوئی۔ رات

کے کھانے میں سید صاحب کو زہر دے دیا گیا۔ رات بھر بے ہوشی میں قے کرتے رہے اور کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی۔ اگرچہ معمول تھا کہ بھتیجے بیٹنے گے بیٹے ہر رات کو مجاہدین پلنگ کے قریب بیٹھتے تھے اور تہجد کی نماز پڑھا کرتے تھے۔ صبح کو میدانِ جنگ میں لے جانے کے لئے شاہ اسمٰعیل آئے تو یہ حال دیکھا۔ اسی حالت میں ہاتھی پر سوار کر کے انہیں میدانِ جنگ میں لے جایا گیا۔ سید صاحب کے پہنچتے ہی درّانیوں اور سمہ والوں نے مُنہ موڑ لیا اور فتح شکست سے بدل گئی۔ بڑی مشکل سے جان بچا کر سید صاحب کو چنہ لئی لے جایا گیا۔ ساتویں دن جب ان کو ہوش آیا تو فرمایا:-

"یہ سب کچھ میری خطاؤں کی وجہ سے ہوا۔ اس تکلیف کے بعد اللہ ربّ العزّت بہت راحت دے گا۔"

یہ صحیح ہے کہ یار محمد خاں نے دشمنوں سے سودا کر لیا تھا لیکن یہ سودا مجاہدین سے اُمید بر نہ آنے کی صورت میں ہوا ہوگا۔ اگر مجاہدین اس کو خوش رکھتے تو یار محمد عہد نہ توڑتا۔ ممکن ہے کہ اس اختلاف میں مذہبی اختلاف بھی جزوِ اعظم ہو۔ تندرست ہو کر سید صاحب نے سوات و بونیر کا دورہ کیا۔ مختلف سرداروں کو دعوتِ جہاد دی۔ ان کے اختلافات دور کروائے۔ عقائد و اعمال کی اصلاح کی۔ دینی ذوق میں بالیدگی ہوئی۔ اب یہاں سے جہاد کی تبلیغ اور چندہ حاصل کرنے کے لئے ہندوستان کو داعی بھیجے۔ دو ماہ کے بعد اوائل ذوالحجہ میں مولوی عبدالحی کے دہلی سے آنے کی خبر سنی۔[1] سید صاحب پنجتار پہنچے اور دھنڈ کی بجائے پنجتار

---

[1] سفرِ جہاد میں اجمیر سے کسی خاص کام کے لئے مولوی عبدالحی کو دہلی بھیج دیا گیا تھا۔ اب وہاں سے واپسی اب ہوئی۔

کو مرکز بنایا۔ ہنڈوالوں سے چند سرداروں کے تعلقات خوشگوار نہ تھے اور وہ ہنڈ جاکر سید صاحب سے ملنا گوارہ نہیں کرتے تھے۔ اسی غرض سے مرکز کو تبدیل کرنا ضروری سمجھا مگر فطرتاً یہ تبدیلی بُرے نتائج بھی اپنے اندر رکھتی تھی اور خادی خاں کو یقیناً ناگوار ہونا چاہیئے تھی۔ بہرحال سید صاحب کی دعوت جہاد کی قبولیت و پذیرائی کا یہ شاندار دور تھا، ہندوستان سے بھی قافلے آنا شروع ہو گئے تھے۔ سرداران ہزارہ نے اطاعت قبول کر لی تھی۔ ہزارہ سے سکھوں کو نکالنے کی تیاری کی گئی۔ اس جنگ میں پائندہ خاں رئیس امب شریک نہیں ہوا اور قبائل خیبر نے عین حالت جنگ میں ساتھ چھوڑ دیا، لہٰذا شکست سے سابقہ پڑا، شبخون ڈمگلہ اور شنکیاری کے بعد مولوی محبوب علی شرکت جہاد کے لئے دہلی سے آئے۔ درمیان میں یار محمد خاں نے راستہ مسدود کر دیا۔ تو بڑی مشکل سے سید صاحب نے انہیں پنجتار لانے کا انتظام کیا۔ مولوی محبوب علی صاحبِ فہم و ذکا تھے تمام کیفیت و حالت کا اندازہ کر لیا، اصلاح کی تدبیریں بھی گوش گذار کیں، مگر ان کی نہیں سُنی گئی۔ آخر کو دل برداشتہ ہو کر انہوں نے واپسی کی ٹھیرائی، بہت سے مجاہدین یہاں کی حالت سے تنگ آ چکے تھے۔ وہ بھی مولوی محبوب علی کے ہمراہ واپس ہوئے۔ یہ کہنا کہ مولوی محبوب علی تنگ مزاج تھے اور تکلیف برداشت کرنے کے عادی نہ تھے محض افترا ہے۔ اس کے بعد اپنے نقص و کمزوری کو محسوس کر کے سید صاحب نے پھر دورہ کرنا شروع کیا اور عرصہ تک

خیبر میں مقیم رہے، یہیں ۸ شعبان سنہ ۱۲۴۳ھ ۱۸۲۸ء کو مولوی عبدالحی کا انتقال ہوا۔ غازیوں کے زہد و تقویٰ سے ہر شخص متاثر تھا۔ عورتوں کا کہنا یہ تھا کہ سیّد بادشاہ کے ساتھی خلقتاً خواہش نفس سے محروم ہیں یا اولیاء ہیں۔ یار محمد خاں کی منافقت پر اس کے قتل کا فتویٰ دیا گیا۔ آتمانزئی کی جنگ میں جب دُرّانیوں سے مقابلہ ہوا تو رئیس آتمانزئی نے دھوکہ دیا اور مجاہدین کو شکست برداشت کرنا پڑی

مولوی محبوب علی کی عظمت و وقعت کا ثبوت یہ ہے کہ ان کی واپسی پر ہندوستان سے مدد جاتا بند ہو گئی اور ان افواہوں کی قلعی کھل گئی کہ سرحد میں سیّد صاحب کی سینک کھڑی ہوئی ہے۔ دوران جنگ میں سکھوں کی توپوں کا مُنہ بند کر دیتے ہیں۔ لاہور کی جامع مسجد میں عید کی نماز پڑھیں گے اور فلاں تاریخ کو امیر المومنین کے ہاتھ سے رنجیت سنگھ مارا جائیگا۔ وغیرہ وغیرہ۔ یہ واقعہ ہے کہ غدر ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف جو فتویٰ تیار ہوا تھا، اس پر دستخط کرنے سے مولوی محبوب علی نے انکار کر دیا تھا۔ اس کے صلہ میں انگریزوں نے ان کو جاگیر دینا چاہی مگر مولوی محبوب علی نے انکار کر دیا کہ وُہ میری شرعی رائے تھی، میں کسی انعام کا مستحق نہیں، ایسے شخص کو مخل بتانا کہاں تک صحیح ہو سکتا ہے۔ بہرحال اس زمانہ میں جبکہ ہندوستان سے مدد پہنچنا بند ہو گئی تھی۔ سیّد صاحب کی تفصیل یہ ہے کہ انہیں تنخواہ دار فوج رکھنا پڑی تھی اور مجاہدین ڈھونڈے نہیں ملتے تھے۔ آخر کار شاہ محمد اسحاق نے جو شاہ عبدالعزیزؒ کے نواسے

اور جانشین تھے، مدد کو پھر جاری کروایا تو سید صاحب کے دم میں دم آیا۔ اس سے ظاہر ہے کہ شاہ محمد اسحاقؒ اس تحریک جہاد کے معین و معاون تھے محض دہلی سے چندہ جمع کرنے کے ایجنٹ ہی نہیں تھے مولوی عبدالحی کو بھی غالباً شاہ محمد اسحاق سے کچھ خلش تھی یعنی ان کو نظر انداز کر کے دوسرے داماد کے صاحبزادے محمد اسحاقؒ کو شاہ صاحب نے اپنا جانشین بنایا تھا یہی خلش شاہ اسمٰعیل سے رفاقت کا باعث ہوئی مگر وہ حلیم الطبع تھے، اپنے قلبی صدمہ کو انہوں نے ظاہر نہیں ہونے دیا۔ لیکن غضب ہے کہ مولوی عبدالحی کے انتقال کے بعد شاہ محمد اسحاق جیسے ہمدرد سے بھی علیحدگی اختیار کر لی گئی۔ اس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ شاہ اسمٰعیل بھی شاہ محمد اسحاقؒ سے اپنے قلب میں کچھ ملال یا رقابت رکھتے تھے لہٰذا مرکز سے رشتہ توڑ لیا گیا۔ ان حالات سے اندازہ ہوتا ہے کہ بیعت امارت کے باوجود سب تدبیریں اُلٹی ہوگئیں اور بُری گت بن گئی۔ تقریباً دو برس کے بعد نیا نسخہ ۵ ؍ شعبان سنہ ۱۲۴۴ھ ۱۸۲۹ء کو بیعت امامت شرعیہ کا ایجاد کیا گیا۔ واقعی ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ یہ نہ کرتے تو کیا کرتے بیعت امارت نے سید صاحب کو نظم قوائے جہاد کا مجاز بنایا تھا۔ اب اس نئی اقامت شرعیت کی بیعت نے احکام شرعی نافذ کرنے کا مرکز بنا دیا۔ گویا حکومت الٰہی قائم کی گئی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جہاد کا رُخ سکھوں کی طرف سے پھیر کر مسلمانوں کی طرف کر دیا گیا اور آپس کے مذہبی و تمدنی اختلافات کو دور کرنے کی طرف توجہ دکو ختم کی گئی

اور یہ کام حکومت الٰہی کی ہی تقویت پر ہو سکتا تھا۔ سب رؤسا اور غربا پر شرع کی پابندیاں عائد کر دی گئیں۔ محتسب مقرر کئے گئے، قاضی بنائے گئے، مقدمات کا فیصلہ شرعی قانون سے ہونے لگا اور منکروں اور مجرموں کو سزائیں دی جانے لگیں۔ منفعل ذہنیت کی وجہ سے شرع خود رسمی ہو کر رہ گئی تھی۔ بہر حال آب ندیدہ موزہ کشیدہ کے اصول پر ایسا کام چلایا کہ تاریکی چھٹ گئی اور اسلام کا نام چمکنے لگا۔ چنانچہ قضیۂ مانیر کے قضیئے کو بڑی خوبی سے قطعی شرعی اصول پر صحیح طور پر طے کیا گیا۔ نوّے برس ہوئے تو مانیر کے اصلی باشندوں کو نکال کر غاصبوں نے قبضہ کر لیا تھا۔ اب اتنی پشتوں کے بعد قضیہ اُٹھا۔ اصلی باشندوں کے مددگار اشرف خاں اور غاصبوں کے حامی خادی خاں تھے۔ شرعی فیصلہ ہوا کہ اصلی باشندوں کو حق دلایا جائے جب قابضوں نے اس فیصلہ کو تسلیم کرنے سے انکار کیا تو بزورِ شمشیر تعمیل کروائی گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اشرف خاں اور خادی خاں میں ٹھن گئی اور جنگ کی نوبت آئی۔ یہ شرعی فیصلہ یہاں کے ماحول میں باعث عناد ثابت ہوا۔ ان الٰہی احکام کو غلط طریقہ اور غلط جگہ استعمال کیا۔ خادی خاں کو شکست دے کر اشرف خاں خوشی میں اتراتے ہوئے گھوڑے پر واپس آرہے تھے کہ گھوڑے نے ٹھوکر کھائی۔ راکب و مرکوب دونوں گر پڑے اور اشرف خاں جاں بحق ہوئے۔ اس کے بعد ان کی وراثت کا مسئلہ چیونٹیوں بھرا کباب تھا

خادی خاں اشرف کے لڑکے منقرب خاں کے موافق تھے کیونکہ وہ ان کا بہنوئی تھا اور اس کے بہنوئی تھے۔ سیّد صاحب نے دوسرے لڑکے فتح خاں کے حق میں فیصلہ کیا اور اس کو ہی وارث بنا دیا۔ خادی خاں اس پر علانیہ منحرف ہو کر سکھوں سے جا ملا اور جنرل ونتورا سے اعتراض کروایا کہ مانیر خالصہ کی ملکیت ہے۔ آپ کو اس کا فیصلہ کرنے کا حق نہیں تھا۔ سیّد صاحب نے جواب دیا کہ ملکیت خدا کی ہے اور خدا والے ہونے کی وجہ سے ہمیں پورا حق حاصل ہے۔ ونتورا منہ کی کھا کے واپس چلا گیا۔ اٹک کے مسلمانوں نے عرض کیا کہ سکھوں سے ہماری بھی گلو خلاصی کروائی جائے۔ تجویز یہ ٹھہری کہ سیّد صاحب کے مجاہدین برات کے جلوس کی شکل بنا کر شہر اٹک میں داخل ہوں پھر شکی ان کی مدد کریں اور قبضہ کر لیں۔ اتفاق سے برات کا راز فاش ہو گیا اور غازیوں کو زک اٹھانا پڑی۔ شرعی احکامات کے بہ نتائج دیکھ کر پنجتار میں ۶ فروری ۱۸۲۹ء کو علما کا شاندار اجتماع ہوا۔ اس میں طے ہوا کہ امام کی اطاعت ضروری ہے، انکار کرنے والا باغی ہے اور باغی کی سزا قتل ہے لیکن اصل بناءِ اختلاف پر توجہ نہیں کی گئی۔ رات کو مفاہمت کے لئے خادی خاں سے سیّد صاحب نے گفتگو کی کہ آج مجلس علما کے فیصلہ سے ناراض ہو کر آپ چلے گئے تھے۔ آپ کو نہیں چاہیئے کہ علما کی حکم عدولی کریں۔ اس نے جواب دیا کہ "ان ملاؤں کی گذر ہماری خیرات پر ہے اور وہ ہمارے

تابع ہیں۔ اس کے علاوہ ان کو خبر نہیں کہ سیاسی معاملات کیا ہیں، اپنے کاروبار ریاست کو ہم ہی بہتر سمجھتے ہیں۔ مجھے اپنی جہالت کا اقرار ہے مگر کیا کروں کہ آپ کی عجیب باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں" علما کی تحقیر سن کر سید صاحب کو غصہ آگیا اور گفتگو ختم ہوگئی اور مفاہمت نہ ہوسکی۔ اس کے بعد پنجتار میں جنگ ہوئی۔ آدھے سے زیادہ غازی درانیوں اور خادی خاں سے ساز کر گئے اور مجاہدین کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ یہ جنگ ۵ محرم ۱۲۴۵ھ مطابق ۱۷ جولائی ۱۸۲۹ء کو ہوئی تھی۔ بعد میں مجاہدین نے صفر ۱۲۴۵ھ میں ہنڈ پر حملہ کیا۔ غازیوں کی فتح ہوئی۔ ایک گولی نے خادی خاں کا کام تمام کردیا۔ پھر سب کی مرضی کے خلاف خادی خاں کے اہل و عیال کو آزاد کر دیا گیا اور خادی خاں کے بھائی امیر خاں کو ریاست ہنڈ کا فرمان لکھ دیا، مگر شاہ اسمٰعیل نے اس فرمان کو مسترد کر دیا۔ اب امیر خاں کے ساتھ مقرب خاں بھی منحرف ہو گیا اور ان سب سے زیدہ میں جنگ ہوئی۔ اس جنگ میں یار محمد خاں زخمی ہو کر جان بر نہ ہوسکا۔ غازی کامیاب ہوئے لیکن ہنڈ میں کسی نے غلط خبر سید صاحب کو دی کہ زیدہ میں غازی ہار گئے تو سید صاحب نے پنجتار کی راہ لی۔ یہ واقعہ ۵ ربیع الاول ۱۲۴۵ھ کا ہے۔

سلطان محمد خاں اب تنہا رہ گیا تھا، اس پر بڑی بنی، آخر کار وہ بھی سید صاحب کی مخالفت پر مجبور ہو گیا۔ سلطان محمد خاں نے

ہنڈ کو فتح کر کے امیر خاں کے حوالے کر دیا۔ سید صاحب نے پائندہ خاں سے ناراض ہو کر عشرہ کوٹلہ پر قبضہ کر لیا، بعد کو اس سے بذریعہ صلح امب لے لیا اور بجائے پنجتار امب کو مرکز بنایا، دینی احکامات جاری کئے گئے۔ حکومت الٰہیہ کا اعلان کیا گیا۔ اس کے بعد پھر پائندہ خاں سے مقابلے ہوئے۔ آخر کار بڑی جاگیر عطا کرنے کے وعدہ پر اس سے صلح کر لی گئی۔ ہری سنگھ کہیں جا رہا تھا، اس شبہ پر کہ پھولڑے پر حملوں کا ارادہ رکھتا ہے، غازی چڑھ دوڑے تو ہری سنگھ جان بچا کر نوک دم بھاگ گیا۔

رنجیت سنگھ نے وزیر سنگھ اور حکیم عزیز الدین کو پیغام صلح لے کر بھیجا کہ اتنا حصہ ملک انہیں دیا جا سکتا ہے۔ جواب میں سید صاحب نے مولوی خیر الدین شیر کوٹی کی معرفت سفارت بھیجی جو بجائے رنجیت سنگھ سے ونتورا سے ملاقات کر کے واپس آئی۔ سکھوں کے شرائط انہوں نے قبول نہیں کئے اور اپنے شرائط پیش نہیں کئے۔ ورنہ یہ ممکن تھا کہ مسلمانوں کے حق میں مفید صلح ہو جاتی، مگر یہاں مرغ کی ایک ہی ٹانگ تھی کہ سکھوں کو فنا کر کے رہیں گے۔

سید صاحب کا امب پر قبضہ ہو جانے کے بعد سلطان محمد خاں پائندہ خاں اور سکھوں نے سید صاحب کی مخالفت پر معاہدہ کیا۔ یہ سن کر سید صاحب امب کے مورچوں کی مرمت کروانے لگے اور حملہ کے خوف سے شاہ اسمٰعیل کو مکرر لکھا کہ یہاں سے لے جا کر

عورتوں اور بچوں کو ستھانہ پہنچادیں۔ انہوں نے جواب دیا کہ "اگر عورتوں اور خصوصاً آنجناب کے حرم محترم کو امب سے ستھانہ پہنچانے سے شوکتِ اسلام کو نقصان پہنچا تو اس کے لئے خدا کے یہاں آپ جوابدہ ہوں گے۔ یہ بھی یقین رکھئے کہ جب تک سو غازیوں کے سر نہ کٹ جائیں گے۔ خدانخواستہ آپ کے حرم محترم تک نوبت نہیں آئے گی"۔ سید صاحب نے اس پر تحریر فرمایا کہ میرے بھانجے سید احمد علی کی طرح سچی بات کہنے میں میاں صاحب بھی مراعاتِ ادب کی پرواہ نہیں کرتے۔ مگر مہر صاحب یوں لکھتے ہیں کہ اس میں مراعاتِ ادب کے خلاف کوئی بات نہیں تھی (سید احمد شہید ص۲۳۱۔ بہرحال یہ اپنی اپنی سمجھ ہے)

غرض ہوتی پر تسلّط ہو جانے کے بعد سلطان محمّد خاں کو سید صاحب نے مفاہمت کے لئے خط لکھا۔ اس نے جواب دیا "تم مصنوعی فقیر ہو۔ ہم نے تمہارے قتل کی ٹھان لی ہے تاکہ یہاں کی زمین تمہارے وجود سے پاک ہو جائے"۔ اس تحریر کے بعد لڑائی ناگزیر ہو گئی تو مہیار پر سلطان محمد خاں کو شکست دی، پھر مردان والوں سے صلح کے ساتھ تصفیہ ہو گیا۔ اس شرط پر کہ لشکر گڑھی کے باہر ٹھہرے اور امیر المومنین گڑھی میں قیام فرمائیں۔ تورو سے جب سید صاحب یہاں آئے تو اس معاہدہ کی انہیں خبر نہیں تھی، اس لئے مع لشکر گڑھی میں داخل ہو گئے۔ گڑھی والوں نے شاہ اسمٰعیل سے اس بدعہدی کی شکایت کی تو شاہ اسمٰعیل نے سید صاحب کے پاس جاکر غصّہ میں کہا

"جناب خود خلافِ شرع امر کے مرتکب ہُوئے ..... یہ لشکر ہے ایسے میدان میں ٹھیرنا چاہیئے۔ پیرزادوں کا قافلہ نہیں ہے کہ قصبہ میں گھس آئے" یہ روایت منظورہ کی ہے۔ وقائع نے بنوع دگر اسی کی تکرار کی ہے اور لکھا ہے کہ لوگوں کو شاہ صاحب کا انداز پسند نہیں آیا۔ بعد کو مولانا نے معافی مانگی تو سید صاحب نے کہا کہ مجھے معاہدہ کی خبر نہ تھی ورنہ ایسا ہرگز نہ ہوتا (سید احمد شہید ص ۲۶۴) یاد نہیں کہ جناب مہر صاحب نے اس کی کیا توجیہ کی ہے۔

تورو میں سید صاحب کے دسترخوان پر کھانے کے لئے جو گوشت پیش کیا تھا۔ وہ کچھ جل گیا تھا۔ سید صاحب نے گوشت نہیں کھایا اور دال پر گذر کی۔ ساتھ ہی پکانے والے کو مردود کا خطاب مرحمت فرمایا جب میاں نظام الدین نے ٹوکا تو اقبال جرم کیا کہ بے اختیاری میں یہ لفظ مُنہ سے نکل گیا تھا اور میاں عبداللہ سے اس کی معافی مانگی (سید احمد شہید)

سلطان محمد خاں کی منافقت کا مزا چکھانے کے لئے پشاور پر حملہ کی ٹھیری۔ اثنائے راہ میں سب لوگوں نے استقبال کیا اور کوئی مانع نہیں آیا۔ ارباب فیض اللہ خاں نے بیچ میں پڑ کر سلطان محمد خاں کا قصور معاف کروا دیا۔ پشاور میں امارت شرعیہ قائم کی گئی اور اسی کے انتظام کے لئے پشاور پھر سلطان محمد خاں کے سپرد کر دیا گیا۔ اگرچہ دنیا بھر اس کے خلاف تھی اور خود بھی اس کو بہتر نہیں سمجھتے تھے۔ پشاور کا

اس طرح انتظام کرکے پہنچا رہا تھے ہوئے گڑھی امان زئی کے ایک بالاخانہ پر سید صاحب مقیم ہوئے تھے۔ ایک لڑکا تحفہ میں پھل لایا تھا اور سیڑھی پر کھڑے ہو کر زیادہ انعام کے لئے اصرار کر رہا تھا۔ اُترنے اور چڑھنے کا راستہ بند ہو جانے کی وجہ سے شاہ اسمٰعیل نے اس لڑکے کے کئی طمانچے رسید کئے اتفاق سے ایک مرتبہ وار خالی گیا تو سیڑھی کی ایک کیل شاہ صاحب کی ہتھیلی میں چبھ گئی اور خون نکلنے لگا۔ اتنے میں سید صاحب آ گئے اور خون نکلنے کی وجہ دریافت کی۔ منشی محمد انصاری نے اس واقعۂ جہاد کی داستان سنادی تو ارشاد فرمایا کہ میاں صاحب آپ کا غصہ ان دنوں بہت بڑھ رہا ہے اسے دُور کرنا چاہیئے، اس کے بعد منشی صاحب نے کہا۔ مولانا عبدالحی کو غصہ آتا تھا۔ مگر وہ جادۂ شرع سے نہیں ہٹتے جواب میں شاہ اسمٰعیل نے توجیہہ فرمائی ...... ان کا غصہ آدھد تھا.... اور میرا غصہ آمد ہے، جب آتا ہے تو عقل و ہوش پر غلبہ پالیتا ہے، زبان کیا۔ کسی عضو پر بھی قابو نہیں رہتا" مولانا مہر صاحب نے ازراہ شفقت تاویل فرمائی ہے کہ شاہ صاحب حقانی و ربانی آدمی تھے۔ اس لئے عیوب کا اقرار کر لیتے تھے۔ (سید احمد شہید ص۲۸۵)

اس جواب اور تاویل پر ظرافت کی دیوی اس قدر گدگداتی ہے کہ قہقہہ نکل جاتا ہے۔ قربانش شوم روزِ محشر پیش داور۔ مولانا مہر کی تاویل کام نہ آسکے گی۔ پنبہ کجا کجا نہم۔

ایک مرتبہ سوات والوں سے معاملہ تھا۔ شاہ اسمٰعیل نے انہیں

سمجھایا مگر انہوں نے یہی جواب دیا کہ اگر ہم پر عُشر قائم کیا جائے گا تو ہم گھر چھوڑ کر چلے جائیں گے۔ ارشاد فرمایا کہ امیر المومنین کے حکم سے مجبور ہوں ورنہ از روئے شرع تمہارے انکار پر تم سب کو قتل کر دیتا (سید احمد شہید)

پشاور کی فتح کی وجہ سے خیبر سے لے کر اسب ملک اثر قائم ہو گیا اب سکھوں کی خبر لینے کا زریں موقع تھا مگر قضا و قدر یا شامت اعمال کا کیا علاج ؟ عمال اور قاضیوں کی نفسانیت بروئے کار آئی۔ عُشر کی وصولی کے لئے بیحد سختیاں کیں۔ قاضیوں نے زبردستی شادی شدہ کنواریوں اور بیواؤں کے نکاح پڑھوانے شروع کر دیئے۔ ایک مرتبہ کسی عورت نے دوسری عورت کو طعنہ دیا کہ تیرا شوہر کالا ہے۔ اس نے سید صاحب سے شکایت کی تو سید صاحب نے طعنہ دینے والی کو سزائے تازیانہ سے نوازا۔ پہلے ان عورتوں کا خیال تھا کہ سید بادشاہ کے غازی اولیا ہیں۔ اب اس کے برعکس نکلے۔ پختون اس طرح اپنی عزت و ناموس کو برباد ہوتے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ سازش کا منصوبہ گانٹھا گیا۔ سید صاحب کو متعدد مرتبہ ہونے والی سازش کی اطلاع دی گئی مگر انہوں نے کان نہیں دھرے۔ آخرکار سید محمدؐ اصغر روئے کہ دو تین دن میں خود ہی انکشاف ہو جائے گا۔ سید محمدؐ اصغر کا رونا کل صاحب ایمان و باحیا غازیوں کا رونا تھا۔ آخرکار ایک دن پختونوں نے جملہ قاضی و عمال کا بہ اختیار خود پشاور سے عدم آباد کو تبادلہ کر دیا۔

جب پشاور میں یہ واقعہ ہو گیا تو طوطے ہرن ہو گئے۔ جھلی کٹ گئی۔

بدحواسی میں سیّد صاحب کے مُنہ سے یہ رٹتے ہُوئے کلمات ادا ہوئے کہ "ہم ابتدا میں یہاں آئے تھے تو ان لوگوں کے حالات سے پوری طرح واقف نہ تھے۔ وعظ و نصیحت کا نتیجہ نہ نکلا تو حاکمانہ فہمائش کا طریقہ اختیار کیا گیا۔ یہ طریقہ بھی بے اثر رہا۔ حالانکہ اجرائے دین کے سوا ہمارا کچھ مدعا نہ تھا۔۔۔۔ اب ہم وہاں مقیم ہوں گے جہاں صادق القول مل جائیں گے"۔ سیّد صاحب کی معصومیّت مجبور تھی کہ اپنا ٹھینڈٹ نہ دیکھے اور دوسروں کو قصوروار بنائے۔ اس کے بعد ہجرت کا اعلان کیا۔ سب لوگوں کو بیعت سے آزاد کیا۔ جب کچھ لوگوں نے ہجرت سے باز رکھنے کی کوشش کی تو فرمایا "مجھے اِن لوگوں سے نفرت ہے جیسے کسی کو قے سے ہو" فتح خاں سے کہا "یہ لوگ کلمۂ توحید بھی عادتاً پڑھتے ہیں، لہٰذا ضروری ہے کہ ہم اپنے دل کی دوا کریں تاکہ کلمہ گویوں کی طرف شک زائل ہو جائے"۔

ان الہامی ارشادات کو بھلا فتح خاں کیا سمجھ سکتے تھے۔ وقتِ وداع آخری خطبہ یہ دیا "ہمارے ساتھ وہی آئے جو تکالیف پر مالک کے خلاف حرفِ شکایت زبان پر نہ لائے۔ ایسا نہ ہو کہ تکلیف کی صورت میں کہا جائے کہ سیّد نے دھوکہ دیا، پھر وصیّت فرمائی کہ "جُدا ہونے والے بھائیوں کو خراسان، ہندوستان یا دُوسرے ممالک میں بسنا نہیں چاہیئے بلکہ عرب کے سوا اَور کہیں توطن اختیار نہ کریں۔ اگرچہ بدعات سے ملک عرب بھی خالی نہیں"۔ عادتاً یہ فقرے اَور

نصیحتیں کہہ کر مآل اندیشی و خیر خواہی کا بھی ثبوت بہم پہنچا دیا۔ سب سے آخر میں شاہ اسمٰعیل سے سرگوشی کی کہ "میاں صاحب آپ قرآن شریف کی تلاوت کی طرف توجہ زیادہ فرمائیں اور بہ کثرتِ مراقبہ میں مشغول رہیں گا، یہاں تک کہ ہم ایسے مقام پر پہنچ جائیں جہاں سے جہاد کا انتظام ہو سکے"۔ (اس کا مطلب یہ ہؤا کہ اپنے جدید اصول کے مطابق ولایت انبیاء کی منزل طے کر کے ولایت اولیاء کے مقام میں داخل ہو گئے) یہاں سے روانہ ہو کر دامن کوہ میں پہنچے تو ساتھ رہ جانے والوں سے اس امر پر بیعت لی کہ خواہشِ نفسانی وغیرہ میں اپنے اوپر مسلمان بھائیوں کو مقدّم رکھا جائے اور مقامِ تکلیف میں خود کو مقدم سمجھا جائے (یعنی ولایت اولیاء میں اس قسم کے ہی مجاہدے ہوتے ہیں) سب ساتھیوں نے بیعت اس امر پر کی مگر شاہ اسمٰعیل نے نہیں کی اس واسطے کہ شاید میں نہ نباہ سکوں (اللہ رے مردِ مجاہد کی احتیاط اور اس کا حوصلہ۔ کاش کوئی صاحب شریعت شاہ اسمٰعیل کی عاقبت کوشی اور مآل اندیشی پر روشنی ڈالیں)

۵ ذی قعدہ کو اتوار کے دن سچوں سے سیّد صاحب مع اپنی مختصر جماعت کے بالاکوٹ کے لئے روانہ ہوئے۔ اب ان کی طبیعت میں تغیّر واقع ہو گیا۔ تفویض و توکّل کا رنگ نمایاں تھا اور تدبیروں سے دلچسپی باقی نہیں رہی تھی۔ اتنے میں شیر سنگھ نے بالاکوٹ کا محاصرہ کر لیا۔ ۶ مئی ۱۸۳۱ء ۲۴ ذیقعدہ کو جنگ بالاکوٹ کے دن سیّد صاحب مسجد زیریں میں تھے، یکدم تکبیر کہتے ہوئے چل پڑے۔ دلدل میں چھلانگیں مارتے ہوئے جا رہے تھے کہ نظروں

سے اوجھل ہو گئے۔ پھر نہ بصارت کو نظر پڑے اور نہ بصیرت کو دکھائی دیتے۔ خدا جانے توپ کا گولا اڑا لے گیا۔ حضرت مسیح علیہ السلام کی طرح آسمان پر چڑھ گئے۔ کسی بگڑے دل ساتھی نے تلوار کے گھاٹ اتار کر دلدل میں دبا دیا۔ پھر واپس آنے کے لئے مصلحتاً غائب ہو گئے یا بقول پروفیسر فری لینڈ ایبٹ میدان جنگ میں نعش پہچان لینے کے بعد سکھوں نے نذرِ آتش کر دیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

من وعن حالات و واقعات پیش کر دیئے گئے۔ اب ہر شخص بذاتِ خود نتیجہ نکال لے۔ خاکم بدہن میری آنکھوں میں خاک نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ جہاد نے فساد کی صورت اختیار کر لی۔ مامور ہونے کا دعویٰ غلط، انتخاب امارت مشکوک و بے معنی معلوم ہوا۔ کمانڈران چیف شاہ اسمٰعیل تھے اور سید صاحب محض بگل بجانے والے تھے۔ حیرت ہے کہ خدائے تعالےٰ نے ہمکلامی چھوڑ دی۔ خواب میں بشارتیں بند ہو گئیں۔ الہام بادِ ہوائی بن گیا۔ رجال الغیب کی ہمراہ رہنے والی قدسی جماعت نے رہبری نہیں کی۔ حلم کا نام نظر نہیں آتا۔ مختلف قسم کی بیعتیں اور ہر مرتبہ مرکز کی تبدیلیاں راس نہیں آئیں۔ قدرت نے اشارے کئے مگر آنکھیں نہیں کھلیں۔ ضد اور خبط میں کسی طرح کمی واقع نہیں ہوئی بلکہ اضافہ ہی ہوا۔ جس قدر دعویٰ مقبولیت کیا اُسی قدر واقعات نے تکذیب کی۔ نفس کی گل کاریوں نے ہر موقع پر بہار کا نقشہ پیش کیا۔ ان کا اثبات نفی کے معنی رکھتا تھا۔ جہاد سکھوں سے تھا مگر لڑائی پٹھان

لی، مسلمانوں سے۔ بیعت لینے کے بعد ان پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی تھی۔ مرشد بن کر حکم چلانا آیا، خدمت کا تصوّر نہیں پیدا ہُوا۔ دعویٰ نفاق دُور کرنے کا تھا مگر تشدّد سے نفاق میں اضافہ کیا۔ دشمن کو دوست بنانے کے بجائے دوستوں کو دشمن بنا لیا اور اسی وصف کو قابلِ فخر سمجھا، فتنوں کو کم کرنا تھا مگر شیطان کی آنت کی طرح دراز کر دیا گیا۔ بقول شاہ ولی اللہ "وہ حکیم ہی نہیں جو عوام کو خواہ مخواہ اپنے خلاف کر دے"۔ شے لطیف کی کمی نے ایسی بات نہ کہنے دی جو دل میں اُتر جاتی۔ وہاں کوئی ایسا نہ تھا جو سورۂ توبہ پڑھ کر سُنا دیتا۔ کاش! انہیں غزوۂ تبوک کے حالات کی ہی خبر ہوتی کہ منافقوں کے ساتھ سلوک کیسے کیا جاتا ہے۔ اب کیسے مان لیا جائے کہ ان کی ہر بات صحابہؓ کے اتباع میں ہوتی تھی اور وہ سنّت کی پیروی کرتے تھے۔ تالیفِ قلوب شاید سیّد صاحب کرنا بھی چاہتے تھے مگر شاہ اسمٰعیل کے دل و دماغ میں اس کی بھنک بھی نہیں پہنچی تھی۔ سیّد صاحب نے اعلان ضرور کیا کہ ہوسِ ملک و دولت ہمیں نہیں۔ ہم محض کلمۃ اللہ اور دین کی خاطر لڑتے ہیں مگر لڑائیوں کے جو احوال لکھے گئے ہیں۔ اُن سے یہی نقشہ جمتا ہے کہ ویسی ہی لڑائیاں تھیں جیسی جاہل عرب اسلام سے پہلے اور اسلام کے مقابل میں لڑا کرتے تھے۔ اگر سرحدی مسلمانوں کے دلوں پر مہر لگی ہُوئی تھی تو ان سے توقع ہی فضول تھی۔ ان سرحدی پٹھانوں پر تبلیغ کا اثر نہیں ہُوا۔ اگر صحیح تعلیم دی جاتی تو وہ اپنی جہالت پر قائم نہیں رہتے۔

وہ بھی مسلمان تھے اور یہ بھی مسلمان تھے۔ وہ اپنے رسم و رواج کو مذہب سمجھتے تھے۔ انہیں اپنے ذاتی مذہب پر ناز تھا۔ یہ دونوں اپنی اپنی نوعیت سے منجمد تھے اور فراست سے محروم۔ یہاں وہیں سے دنیا بھاری تھی تو مجاہدین دنیا سے بے نیازی ظاہر کرتے تھے۔ مقصد کو چھوڑ کر فروعات پر سر پھرانا نہ اہمیت رکھتا ہے اور نہ قابلِ فخر ہے۔ وہ اپنی اغراض کی وجہ سے پیر پرست تھے اُدھر یہ مرشد سے بے فیض تھے شرعی نظام جو قائم کیا، اس میں عقل و امن کو دخل نہ تھا بلکہ مشین کی طرح کا تھا۔ حکومت الٰہیہ کی آمدنی مساکین و غربا کے کام نہیں آئی۔ وہ کہتے تھے کہ ہم نے سکھوں سے بیزاری کی وجہ سے انہیں اپنا رئیس بنایا تھا۔ یہ لوگ تو سکھوں سے بھی سوا ہاتھ زیادہ نکلے جب فیض ہی نہیں پہنچا تو بیعت سے کیا حاصل۔ لہٰذا انہوں نے توڑ دی اور اس کو جوڑ لینا ان کے امکان و اخلاق سے بعید تھا جملہ روایتیں ان حقائق کی تصدیق کرتی ہیں۔ سید صاحب کے آخری ارشادات واقعہ پشاور کے بعد سے غیبوبیت تک جو درج کئے گئے ہیں وہ شانِ ولایت سے مطلق تعلق نہیں رکھتے، تحمل ان میں نہیں پایا جاتا۔ سراسیمگی۔ بدحواسی۔ بیچارگی و مایوسی ان سے پڑی ٹپک رہی ہے۔ یہ ہذیانات پاگل کی بکواس کہے جا سکتے ہیں۔ حاشا یہ سید صاحب کے کلام اور احوال سے دُور کا بھی واسطہ نہیں رکھتے۔ یہ سب مرثیہ خوانوں کے

خیالات ہیں جن سے سید صاحب کی توہین ہوتی ہے۔ یہ لوگ سید صاحب کی روحانیت کو نہیں سمجھے، ان کی ترجمانی عجائب پرستی کے رنگ میں کی، ان کی کرامتوں پر ایمان رکھا جن کی قیمت کچھ نہیں اور جن کی تقلید نہیں ہو سکتی اور جو عمل سے بے نیاز رکھتی رہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا حال قال سے مختلف ہے۔ دو عملی میں "نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم"۔ ان میں خود اتحاد کی بو باس نہیں، اتحاد کے گیت گاتے ہیں مگر اتحاد کے متعلق کوئی عمل نہیں کرتے انہوں نے توحید کو جامد بنا رکھا ہے۔ شرعی احکام کو اپنی عقل و مصلحت کے سانچے میں ڈھالتے ہیں۔ شکستگی میں سید صاحب کو اور بھی شگفتہ ہو جانا چاہیئے تھا۔ وہ لکھتے ہیں کہ طبیعت میں تغیر پیدا ہو گیا تھا، تفویض و توکل کا رنگ نمایاں ہوا، تدبیروں سے دلچسپی نہیں رہی۔ بھلا بندۂ تسلیم کو ان باتوں سے کیا تعلق۔ ان کو راہِ تسلیم میں ہشاش بشاش نظر آنا چاہیے تھا۔ انہوں نے بغیر کسی قسم کے تغیر کے ہوش و حواس کے ساتھ ہنسی خوشی اپنی جانِ عزیز جانِ آفرین کی خدمت میں پیش کی ہو گی۔ ان کے کارفرماؤں نے محض ہوائی قلعے بنا کر دکھائے ہیں۔ ان کی روح پاک پکار پکار کر کہہ رہی ہے۔

من از بیگانگاں ہرگز نہ نالم
کہ با من آنچہ کرد آں آشنا کرد

ساتواں باب

تعلیم

قرینہ ہی نہیں بلکہ واقعہ یہی ہے کہ سید صاحب حنفی المذہب تھے اور ان کا مسلک ائمہ اربعہ کے خلاف نہ تھا مگر سید صاحب کے عقیدت مند اور تذکرہ نویس اس کی وضاحت نہیں کرتے اور صرف یہ کہہ کر خاموش ہو جاتے ہیں کہ انہوں نے نجدی تعلیم سے استفادہ نہیں کیا تھا گویا جو کچھ ان کی تعلیم ظاہر کی گئی ہے وہ ان کی اپنی تعلیم ہے لیکن سید صاحب کے دو خطوط مکتوبات شاہ اسمٰعیل میں ایسے شامل ہیں جن میں انہوں نے اپنے حنفی ہونے کا اعلانیہ اظہار فرمایا ہے ان میں ایک مکتوب سوانح احمدی کے ضمیمہ میں موجود ہے جو علماء سرحد کے اعتراضوں کے جواب میں شاہ اسمٰعیل سے لکھوایا تھا۔ اس میں ارشاد فرماتے ہیں کہ "یہ فقیر اور اس فقیر کا خاندان ہندوستان میں گمنام نہیں ہے۔ ہزارہا انسان، خواص ہوں یا عوام۔ اس فقیر کو اور اس کے بزرگوں کو جانتے ہیں کہ اس فقیر کا آبائی مذہب حنفی ہے اور اس زمانہ میں بھی اس فقیر کے تمام

اقوال و افعال حنفیہ کے اصول و قوانین اور ان ہی کے آئین و قواعد پر منطبق ہیں۔ ایک بھی اصول مذکورہ سے خارج نہیں ہے۔ الّا ماشاء اللہ۔ جو ان اصحاب سے غفلت و بھول چوک میں صادر ہو جاتا ہے تو وہ اپنے قصور کا اعتراف کرتے ہیں اور مطلع ہو جانے پر راہِ راست پر آجاتے ہیں"۔ یہ تحریر واضح ہے، اس میں شک نہیں کیا جا سکتا مگر شاہ اسمٰعیل کے اندازِ تحریر پر کچھ شک کیا جائے کہ ابتدائی ضمیر متکلم کو خط کے آخری حصہ میں ضمیر غائب میں تبدیل کر دیا ہے تو یہ بات اصل بیان پر پردہ نہیں ڈال سکتی۔ مولانا عبدالحلیم چشتی صاحب نے رسالہ الرحیم حیدرآباد مورخہ اگست سنہ ۶۵ء میں اس امر کی مزید شہادت پیش کی ہے کہ مولوی کرامت علی جونپوری جو سیّد صاحب کے اعاظم خلفاء میں سے ہیں انھوں نے اپنی کتاب قوت الایمان میں تحریر فرمایا ہے کہ "اس عاصی نے رائے بریلی میں مولانا عبدالحی صاحب سے پوچھا تھا کہ ہم کس پر عمل کریں اور کس امام کی تقلید میں نجات ہے فرمایا، فقہ پر عمل کرو اور چاروں اماموں میں سے جس کی تقلید پر کوئی مرے گا نجات ہے"۔ پھر حضرت مرشد سید صاحبؒ سے پوچھا کہ کس پر عمل کریں تو آپ نے فرمایا کہ "فقہ کے متون پر مثلِ حدیثِ متواترہ آنکھ موند کے عمل کرنا اور فتاوی کو تحقیق کر لینا کیونکہ اس میں نرم و گرم سب طرح کی روائتیں لاتے ہیں اور یہی بات شاہ عبدالعزیزؒ وغیرہ علمائے دین کی تصنیفات سے ظاہر ہے"۔ پھر اپنی دوسری کتاب

"نورٌ علیٰ نور" میں مولوی کرامت علی صاحب نے تحریر فرمایا ہے کہ "مرشد برحق آپ مقلد تھے اور تقلید کے خلاف جو کوئی شخص کرتا تو اپنی محفل سے نکلوا دیتے اور جو تعلیم پذیر ہوگا تو حضرت مرشد برحق اس کو نصیحت کر کے راہِ راست پر لاتے اور یہ بات تمام ہندوستان اور بنگالہ میں مشہور ہے"۔ غرض ان تمام شہادتوں کی تصریح کر کے مولانا عبدالحلیم چشتی صاحب اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ سیّد صاحب شاہ عبدالعزیزؒ کی طرح پکے حنفی تھے اور ان ہی کے طریقہ پر سختی سے عامل تھے۔ غرض میں آزادیٔ رائے اور آزادیٔ عمل کے قائل نہیں تھے اور نہ اس کو اچھا سمجھتے تھے۔

اب سوال یہ ہوتا ہے کہ باوجود اس خط کے کاتب ہونے کے ولی اللّٰہی گھرانے کے قابل فرد ہونے اور سیّد صاحب کے خلیفہ ہونے کے شاہ اسمٰعیل تقلید کے منکر کیوں تھے اور اگر محقق و مجدّد ہونے کی وجہ سے اپنے اُستادوں اور مرشد کے مذہب کے خلاف غیر مقلد بن گئے تھے تو سیّد صاحب ان کے روادار کیوں ہوئے۔ شاہ اسمٰعیل نے تقویۃ الایمان پہلے لکھی تھی، اس کی تصحیح و اصلاح صراطِ مستقیم سے ہوئی تھی مگر ان دونوں کتابوں میں تقلید سے انحراف موجود ہے۔ محیر العقول یہ ہے کہ مرشد اور خلیفہ کے اختلاف کے باوجود سیّد صاحب کی تعلیم پہ پردہ ڈال دیا گیا ہے اور شاہ اسمٰعیل کے معتقدات کی ہی سیّد صاحب کے عقیدت مند اور پرستار تقلید کیا کرتے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہوئے

کہ شاہ صاحب کا علمِ معقول سیّد صاحب کے علم لدنّی پر سبقت لے گیا اور مقبول ہوا۔ جملہ تذکروں سے مترشح ہوتا ہے کہ شاہ اسمٰعیل امام تھے اور سیّد صاحب باوجود مرشد ہونے کے ان کے مقتدی تھے، سمجھ میں نہیں آتا کہ سیّد صاحب کی تعلیم کی شاہ اسمٰعیل نے اشاعت کی ہے یا سیّد صاحب کی تعلیم میں تحریف کردی ہے۔ عام خیال یہی ہے کہ شاہ اسمٰعیل نے جس تعلیم کی اشاعت کی وہی سیّد صاحب کی تعلیم ہے مگر یہ اس لئے غلط ہے کہ بیعت کرنے کے بعد بھی شاہ اسمٰعیل کا نظریہ وہی رہا جو بیعت سے پہلے تھا۔ جامع مسجد کے وعظوں میں جن عقائد کا وہ اعلان کرتے تھے ان پر علامہ فضل الحق اور دیگر علماء اہلِ سنّت ان سے مباحثے کیا کرتے تھے اور مخالفت کی وجہ سے غلو کرکے جن عقائد کا تقویۃ الایمان میں اظہار کیا ہے۔ انہیں کی تبلیغ سیّد صاحب کی معیت میں دوآبہ کے دورے میں اور اس کے بعد بھی شاہ اسمٰعیل نے کی ہے۔ اس کے بعد قیام رائے بریلی میں صراط مستقیم جو لکھی گئی ہے وہ دراصل تقویت الایمان ہی کی نقل رپٹ ہے جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ سیّد صاحب مفہوم بتاتے تھے اور شاہ اسمٰعیل اس کو اپنی عبارت میں منتقل کرتے تھے۔ مدعا یہ کہ بیعت کرنے کے بعد شاہ اسمٰعیل کے عقائد میں کوئی تغیر واقع نہیں ہوا سوائے اس کے کہ اپنے خیالات کی تصدیق و تائید انہوں نے سیّد صاحب کی عجیب و غریب کرامتوں سے کروائی ہے اور ان میں بھی بعض کرامتیں ایسی ہیں جو کرامتوں کے حدود سے سوا ہیں، لیکن پھر تدبّر کیا جائے تو

کرامتیں کیسی ہی کیوں نہ ہوں، قابلِ استناد نہیں ہوتیں، جہاں تقویۃ الایمان اور صراطِ مستقیم کے مضامین میں اختلاف ہے، اس کی شاہ اسمٰعیل نے کبھی پرواہ نہیں کی اور اپنے دیرینہ معتقدات پر ہی جمے رہے اور انہیں کے اصولوں کی پیروی اب تک جملہ ارادتمند کیا کرتے ہیں، اس طرح گویا نسبت معکوس ہو گئی۔ شاہ اسمٰعیل امام بن گئے اور سید صاحب صدیق ہو کر رہ گئے۔ علمِ ربانی ہمیشہ علم معقول فلسفہ و منطق کے بخیئے ادھیڑ دیا کرتا ہے مگر یہاں علم معقول نے اس علم کو جو کشف و شہود پر مبنی تھا اپنے اندر جذب کر لیا۔ اندریں حالات جن خصوصیات سے سید صاحب کو ممتاز کیا جاتا ہے وہ ان پر صادق نہیں آتیں۔ سید صاحب کی عظمت و ولایت، کرامتوں اور خوابوں سے ثابت کی گئی ہے۔ کرامت کی اصلیت واضح کی جا چکی ہے۔ رویاء صادقہ نبوت کا چالیسواں حصہ بتائی جاتی ہیں، مگر ان کے خوابوں سے پتہ چلتا ہے کہ نبوت کے کسی حصہ کی حد تک وہ نہیں پہنچے بلکہ ولایت ہی کی کسی منزل میں رہے اور یہ ولایتی ترقی بھی جو ظاہر کی گئی ہے، مشکوک ہو کر رہ جاتی ہے۔ ان کی نئی روحانیت کے جدید طریقے کا اگر قدیم روحانیت کے قواعد سے جائزہ لیا جائے تو کرامتوں اور خوابوں سے محض اتنا ثبوت ملتا ہے کہ ان کو صرف کشفِ کونی حاصل تھا اور اصل شئے کشفِ ذاتی ہوا کرتا ہے اور اسی سے کسی بزرگ کی وقعت و عظمت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کشفِ کونی محض تماشا ہے اور نا قابلِ توجہ ہے۔ بہرکیف غور طلب

یہ ہے کہ مرید یعنی شاہ اسمٰعیل نے استفادہ کیا یا شیخ یعنی سید صاحب مرید سے مستفیض ہوئے۔

سید صاحب کی تعلیم اگر شاہ اسمٰعیل کے نظریات سے علیحدہ ہے تو اس پر غلاف ڈال دیا گیا ہے۔ ان کے سوانح حیات سے بعض واقعات کہیں کہیں جھلک دکھائی دے جاتی ہے اور اس جھلک سے تقویۃ الایمان کے مضامین کی تردید ہو جاتی ہے۔ خبر نہیں سوانح نگاروں نے ایسے واقعات قصداً لکھے ہیں یا بے خبری میں انجان پن سے درج کر دیئے ہیں۔ مثلاً سید صاحب محفل میلاد شریف کے قائل تھے۔ حجاز جاتے ہوئے جہاز پر انہوں نے مولود شریف کیا بھی تھا۔ مزارات پر وہ جاتے تھے اور ان سے فیض بھی حاصل کرتے تھے جس کا جابجا ذکر آگیا ہے۔ آثار متبرکہ کی تعظیم بھی کیا کرتے تھے اور ان سے بشارتیں بھی پاتے تھے۔ اولیاء کی حیات بعد مرگ کے قائل و مبلغ تھے۔ آمین بالجہر اور رفع یدین کبھی نہیں کیا۔ امکان نظیر کے وہ مُدعی نہیں تھے۔ پنجتار کے موقع پر جب وہاں کے علما کے سامنے شاہ اسمٰعیل نے عدم وجوب تقلید شخصی کی حمایت کی یعنی غیر مقلد ہونے پر زور دیا تو سید صاحب نے واضح طور پر ارشاد فرمایا کہ "یہ وقت تفرقہ ڈالنے کا نہیں ہے ہم کو اس وقت کفار سے جہاد کرنا ہے۔ تقلید کا جھگڑا اٹھا کر اپنے اندر تفرقہ ڈالنا بہتر نہیں۔ اس جھگڑے سے جس کی بنا ایک فروعی اختلاف سُنّت یا مستحب ہے۔ ہمارا اصل کام ہجرت و جہاد کا جو فرضِ عین ہے

فوت ہو جائے گا"۔ اگر سید صاحب کا یہ اصول اور فیصلہ صحیح نقل کیا گیا ہے تو یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ایسا نظریہ رکھنے والا شاہ اسمٰعیل کی فقہی نکتہ آفرینیوں کا کبھی مؤید نہیں ہو سکتا۔ معتزلہ کی طرح شاہ اسمٰعیل نے اپنی ساری قابلیت فروعات کی لاطائل بحثوں میں صرف کی ہے۔ سید صاحب ان باتوں کو لازمی طور پر تضیع اوقات سمجھتے تھے چنانچہ مناسب مواقع پر اس کا صاف اظہار بھی کر دیا کرتے تھے۔ تقاضا وقت بھی یہی تھا کہ ان کے ارشاد پر عمل کیا جاتا مگر شاہ اسماعیل ٹس سے مس نہ ہوئے اور اپنی بات پر اڑے رہے۔ چنانچہ امداد المشتاق کے صفحہ ۷۹ کے مقالہ نمبر ۱۳۴ میں حاجی امداد اللہ کا ارشاد ہے کہ مولوی اسمٰعیل شہید موحد تھے۔ چونکہ محقق تھے، چند مسائل میں اختلاف کیا اور مسلک پیران خود مثل شیخ ولی اللہ وغیرہ پر انکار فرمایا۔ وحدت الوجود کے قائل تھے اور ان کے مرشد حضرت سید صاحب مسلک وحدت الشہود کا رکھتے تھے۔ باہم گفتگو ہوئی۔ سید صاحب کچھ کبیدہ ہوئے، عرض کیا یہ اور بات ہے کہ دن کو رات کہیئے۔ یہ حکایت مقام مکہ میں واقع ہوئی تھی۔ ایک شخص نے اس کو مجھ سے بیان کیا جو اس مجلس میں حاضر تھے۔ سید صاحب کی تعلیم جو تذکروں میں درج کی گئی ہے مثلاً طریقہ محمدیہ کا اجراء۔ صراط مستقیم کی تصنیف اور وہ اصلاحیں جو رسوم بد اور بدعتوں کے متعلق ہیں، قابل لحاظ ہے۔ اصلاح معاشرہ کے سلسلے میں سید صاحب کے مساعی جمیلہ وہی ہیں جن کی ہدایت و

تلقین شاہ ولی اللہؒ نے کی تھی۔ ان اصلاحوں کی اشاعت شاہ عبدالعزیزؒ نے خوش اخلاقی و خوش اسلوبی سے کی تھی اور شاہ اسمٰعیل نے تشدد و سختی سے کی، لہٰذا اُن کے محدود اور سخت نقطۂ نگاہ کی وجہ سے خاطرخواہ اصلاح نہ ہو سکی۔ طریقۂ محمدیہ کی ایجاد کی وجہ خود سید صاحب سے بیان کروائی گئی ہے۔ مُدعا یہ تھا کہ صوفیہ کے جملہ سلسلوں میں یگانگت پیدا کی جائے رامپور کے قیام میں ایک حکیم صاحب نے دریافت کیا تھا کہ چاروں سلسلوں میں بیعت لینے کے بعد آخر میں اپنے طریقۂ محمدیہ میں جو بیعت لیا کرتے ہیں۔ اس میں کیا بھید ہے۔ سید صاحب نے جواب دیا کہ "اس میں بھید یہ ہے کہ طریقہ چشتیہ قادریہ کے شغل اشغال ہم اس طرح بتایا کرتے ہیں کہ ذکر جہر اس طرح کرو اور ضرب یوں لگاؤ اور نقشبندیہ مجددیہ کے اشغال یوں سکھاتے ہیں کہ ذکر خفی اس طرح کرو اور لطیفہ قلب یہ ہے اور لطیفہ رُوح وہ ہے۔ وعلیٰ ہذا القیاس۔ ان طریقوں کی نسبت رسُول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے بطور باطن کے ہے نہ کہ بطور ظاہر کے۔ (برخلاف ان کے) طریقۂ محمدیہ میں ہم یہ سکھاتے ہیں کہ نکاح اس نیت سے کرو کہ بہ سبب اس نکاح کے فسق و فجور سے محفوظ رہوں گا اور اس نکاح سے اولادِ صالح پیدا ہوگی، علم سیکھے گی لوگوں کو سکھلائے گی نیک عمل کرے گی اور میرے واسطے بعد میرے مرنے کے دُعا کیا کرے گی اور کھیتی تجارت اور نوکری وغیرہ اس نیت سے کرو کہ اس سے روزی حلال کما کر جورو بچوں کا نفقہ ادا کروں گا۔ میں خود روزی حلال کھاؤں گا جو اجزا کی

سے بچوں گا۔ اس نیت سے اس کا چلنا پھرنا اور سفر کرنا سب عبادت ہو جاتا ہے اور جب رات کو سوؤ تو یہ نیت کرو کہ سویرے اس واسطے سوتا ہوں کہ رات کو اٹھ کر تہجد پڑھوں گا۔ نماز صبح اوّل وقت جماعت سے ادا کروں گا بیوی سے خلوت اس نیت سے کرو کہ اس کا حق ادا ہو۔ کپڑے اس نیت سے پہنو کہ ستر ڈھکے اور اللہ کی نعمت کا شکر ادا ہو اور کھانا اس نیت سے کھاؤ کہ اس سے بدن میں طاقت آئے گی تو نماز پڑھوں گا اور سفر حج و جہاد کروں گا اور کھیتی و نوکری وغیرہ کر کے نفقات واجب ادا کروں گا اور علم اس نیت سے پڑھو کہ اس سے احکامات الٰہی و فرض وغیرہ معلوم کر کے اس کے مطابق عمل کروں گا۔ لوگوں کو سکھلاؤں گا۔ پیر کے مرید اس لئے ہوؤ کہ اس سے اللہ کا راستہ سیکھوں گا وعلیٰ ہذا القیاس اور نسبت اس طریقۂ محمدیہ کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بطور ظاہر کے ہے۔

"بہ بیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا"

نسبت ظاہر و باطن میں امتیاز کرنا ایک فقہی استدلال ہے۔ صوفی اس کو قابل توجہ نہیں سمجھتے۔ سیّد صاحب کا مدعا یہ ہے کہ پہلے نسبت باطن کو درست کرلو، پھر نسبت ظاہر کی طرف توجہ کرو، یعنی بغیر نسبت باطن کے نسبت ظاہر درست نہیں ہو سکتی اور امتیاز و فرق ظاہر کرنے کے لئے یہ کہنا کہ ؎ تفاوت رہ از کجاست تا بکجا۔ عجائبات سے ہے نسبت ظاہری و باطنی کا فرق ظاہر کر کے اپنی جدّت پر یہ حضرت نازاں

ہیں مگر ان دونوں نسبتوں کی مثال چشمہ کے اندر اور باہر والے پانی کی طرح ہے۔ چونکہ باہر والے پانی میں بیرونی اثرات سے تغیر واقع ہو جاتا ہے اس لئے اندرونی پانی کی مدد اور ذریعہ سے اس کو پاک کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اسی لئے تفاوتِ رہ کا نعرہ اعلان کرتے ہیں، مگر رہ۔

این خیال است و محال است و جنوں

اندر والے پانی سے مدد لینا اور اس کو ذریعہ بنانا ممکن نہیں، فطری اصول یہی ہے کہ باہر والے پانی کو آمیزشوں سے پاک کر کے اتنا خالص بنا لیا جائے کہ اندر والے پانی سے یگانگت ہو جائے اور اس تک رسائی کی یہی صورت ہے اور انسانی جد و جہد کا یہی حقیقی مقصد ہے۔ دونوں کے فرق دُور کر دینے سے ہی معراج حاصل ہُوا کرتی ہے۔ اسی طرح شریعت و طریقت میں مساوات و لزوم ہے اور اختلاف نہیں ہے۔ بہر حال یہ جواب سُن کر حکیم صاحب مطمئن ہو گئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ حکیم صاحب کو صرف قارورہ دیکھنا آتا تھا۔ تفاوتِ رہ سمجھنے کا شعور نہیں تھا اور شریعت و طریقت دونوں سے نابلد تھے ورنہ وہ کہتے کہ صوفیہ ہمیشہ یہی کہتے ہیں کہ طریقت تابع شریعت ہے اور چشتی تو اس حد تک پہنچے ہیں کہ حالتِ سُکر میں بھی کوئی بات خلافِ شریعت نہ ہو۔ صوفی سے زیادہ کون دعویٰ کر سکتا ہے اور اس کا ہر فعل و قول اللہ کے واسطے ہوتا ہے اور نفسانیت کی بنا پر نہیں ہوتا۔ صوفی کا کمال یہ ہے کہ اس کا ظاہر و باطن ایک ہو جائے اور دو رنگی دُور ہو جائے۔ صوفی یہ بھی

تاکید سے کہتے ہیں کہ معرفت بغیر اکل حلال کے حاصل نہیں ہو سکتی۔ جی تراش دمی خراشی ان کا شیوہ ہے۔ وہ حرامخوری اور عہد یپن کو موت سے بدتر سمجھتے ہیں، غرض صوفی کا مقصد یہی ہے کہ بندہ تسلیم بنے اور اخلاق الٰہی حاصل کرے، ان کے یہاں پندار مصلحت۔ نفس پرستی۔ خودنمائی اور غصے کا نام نہیں ہوتا۔ جب حقیقت یہی ہے تو اس حقیقت کا جاننے والا کبھی بھی کسی نئے طریقے و سلسلہ کی ایجاد کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کر سکتا مگر یہ حضرات طریقت کی منزل طے کرنے کے بعد شریعت کی تعلیم دیتے ہیں گویا اُلٹی گنگا بہاتے ہیں جو سمندر تک نہیں پہنچ سکتی۔ اس طرح نہ خدا مل سکتا ہے نہ وصال صنم۔ اسی بوکھلاہٹ میں للہیّت

. . . .

غائب ہو گئی ہے اور ان کے جملہ تذکروں میں شاہ اسمٰعیل اور سید صاحب کے غیظ و غضب کی داستان ایک جزو بن گئی۔ یہ امر کہ جملہ سلاسل میں یگانگت موجود ہے اور ایسی کوئی مثال نہیں۔ ان کے مجاہدات کا اختلاف مانع اتحاد نہیں۔ وہ سب آپس میں ایک دوسرے کے خلفاء کو اپنی اپنی خلافت سے سرفراز کر کے اپنے طریقے کی تبلیغ کی اجازت دیتے ہیں اور ایسے خلفاء کبھی ہرگز ماوتو کا امتیاز و اظہار نہیں کیا کرتے۔ لہٰذا ایسی صورت میں یگانگت کی خاطر نیا طریقہ ایجاد کرنا حشو و زائد اور بے معنی ہے۔ چنانچہ اسی نو ایجاد طریقہ محمدیہ کا شمار اسی قسم میں ہونا چاہیئے۔ رہا علماء صوفیا کے متحد کرنے کا خیال تو یہ بھی بے ضرورت ہے۔ کامل صوفیوں کا فاضل علماء برابر ادب کرتے ہیں اور ممکن نہیں کہ صوفی فاضل عالم کے سامنے سر نیاز نہ جھکائے البتہ صوفیائے خام اور

علماءِ سوء کا اختلاف دُور کرنے کی ضرورت ہے تو یہ لوگ اپنے اپنے فن میں کمال حاصل کر کے خود بھی متحد ہو سکتے ہیں۔ ان میں کمال پیدا کر دینا ان کے اپنے اپنے کاملین و فاضلین کا فرضِ عین ہے۔ کوئی غیر اس کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکتا لیکن سیّد صاحب نے اس طرف توجہ فرمائی تو نورٌ علیٰ نور۔ مگر جس طرح دونوں میں اتحاد کرنے کی صورت انہوں نے نکالی ہے، اس میں بندر کا سا بانٹ موجود ہے نہ اہلِ شریعت اس کو گوارہ کر سکتے ہیں اور نہ اہلِ طریقت۔ یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ دوعملی سے نہ بچ سکے اور خلیج کو نہ پاٹ سکے۔ نسبت ظاہری اور نسبت باطنی کا فرق طریقہ محمدیہ میں جو ظاہر کیا گیا ہے اس سے بے شعوری کا پتہ چلتا ہے۔ چاہیئے یہ تھا کہ دونوں نسبتوں میں جو نسبت ہے اسی کو مدِنظر رکھتے، کون کہتا ہے کہ نسبت ظاہری و باطنی میں فرق ہے یا شریعت و طریقت جُدا جُدا ہے۔ یہ دونوں تو ایک ہی مقصد کے مدارج ہیں اور دونوں میں مساوات ہے، ملاحظہ ہو کہ شریعت کے حکم کے مطابق نماز پڑھی جاتی ہے مگر کہا جاتا ہے کہ نماز بغیر حضورِ قلب کے نماز ہی نہیں ہوتی۔ نسبت ظاہری سے حضورِ قلب گویا نہیں پیدا ہوتا۔ حضورِ قلب کا پیدا کرنا نسبت باطنی یا طریقت کا کام ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ طریقت بذاتِ خود شریعت میں داخل ہے اور شریعت شاملِ طریقت ہے۔ باوجود ظاہری دوئی کے دونوں میں اتحاد ہے۔ قرآن پاک اور حدیث شریف میں جو کچھ ہے اور جن باتوں پر علماء[1] کا اجماع ہے،

---

[1] یعنی جن باتوں کو علماء فرماتے ہیں۔

اسی کو شریعت کہتے ہیں۔ انہیں اعمال کی تقوےٰ و احتیاط سے تعمیل کرنے کا نام طریقت ہے اور ان اعمال کی برکت سے جو کوائف حاصل ہوتے ہیں اسی کو حقیقت سے موسوم کیا جاتا ہے۔ حدیث شریف اسی امر کو یوں ظاہر کرتی ہے کہ ایمان پوشیدہ ہے اور اسلام ظاہر ہے۔ اسی کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر وضاحت فرمائی ہے کہ شریعت میرے اقوال۔ طریقت میرے افعال اور حقیقت میرے احوال ہیں۔ آدمی شریعت میں اسی وقت کامل ہوتا ہے جب اعمال طریقت پر عمل کرے اور سلوک طریقت اس وقت طے ہوتے ہیں جبکہ اس کی راہ شریعت کے مطابق ہو بعض نادان جنہیں شریعت کی حقیقت کا پتہ نہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ شریعت محض روزہ۔ نماز۔ زکواۃ و حج کا نام ہے۔ انہیں خبر نہیں کہ شریعت خدا اور رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام احکام پر عمل کرنے کا نام ہے جس میں طریقت بھی داخل ہے۔ بعض ناواقف جو طریقت کو پوری طرح نہیں جانتے وہ سمجھتے ہیں کہ طریقت لذتوں کے ترک کرنے اور ماسوئ سے قطع تعلق کرنے کا نام ہے۔ وہ اس بات سے آگاہ نہیں کہ طریقت دراصل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال میں آپ کے اتباع کرنے اور تمام فرائض و واجبات کی ادائیگی پر مشتمل ہے کیونکہ کمالِ شریعت اس سے حاصل ہوتا ہے، پس جو شخص شریعت کی راہ میں کامل ہے۔ طریقت کے احکام میں یقیناً کامل ہے"[1] اب طریقۂ محمدیہ جو ایجاد کیا گیا ہے۔ وہ محض منطقی و کلامی نتائج اور فقہی نکتہ آفرینیوں کا خلاصہ

---

[1] منقول از دو رسالت مصنفہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی

ہے - ان دماغی قلا بازیوں ہی کی وجہ سے نسبت ظاہری و باطنی کی ترتیب میں فرق نمایاں کیا گیا ہے اور حُبِّ ایمانی و حُبِّ عشقی کی ترتیب میں تبدیلی کرنا پڑی ہے - اس طریق عمل سے ظاہر ہے کہ یہ حضرات نسبت باطنی پر نسبت ظاہری کو ترجیح دیتے ہیں - اسی لئے جسمانی محنت و مشقت کی تاکید کرتے ہیں جیساکہ جہاد کی تیاری کے وقت شغل و اشغال کو ترک کر دینے کا حکم جاری کیا اور ان کے کہنے کے مطابق ان کے خلیفہ شاہ عبدالرحیم فاطمی نے تشریح فرمائی تھی کہ "باطنی مشاغل سے مجھے کچھ حاصل نہیں ہوا - گھاس کھودنے - لکڑی چیرنے اور مٹی ڈھونے سے کمالِ روحانیت ملا - اس سے قبل اگر مر جاتا تو عاقبت خراب ہو جاتی - اس نئے طریقہ سے روحانیت میں ہزار درجہ ترقی ہوئی اور سب سے زیادہ یہ کہ اس طرح مجھے نماز پڑھنا آگئی[۱] وغیرہ وغیرہ" - بے شک عابد سے مجاہد کا درجہ افضل ہے - مگر شغل اشغال ترک کر کے جب ان صاحبان نے جسمانی کرتب استعمال فرمائے تو نتیجہ بھی جہاد کا ویسا ہی ملا - تذبذب میں مبتلا رہے نیت ڈانوا ڈول رہی - صحیح فیصلہ نہ کر پائے اور خودی میں خطاؤں کو ثواب سمجھا پھر ناکامی پر شاہ اسمٰعیل سے کہنا پڑا کہ "اب تم تلاوت قرآن پاک کی طرف زیادہ توجہ کرو اور میں مراقبہ میں مصروف رہوں گا" ؎

چرا کارے کند عاقل کہ باز آید پشیمانی

ان کے نئے اصولوں کے مطابق ولایت ولی مؤخر ہو گئی اور ولایت نبی مقدم ٹھیری مگر اس انقلاب و تغیر سے نہ منزل تک رسائی ممکن تھی اور نہ ہو سکی

---

[۱] غالباً سلسلہ صابریہ سے اسی لئے استعفیٰ دیا کہ تعلیم صابری انہیں نماز پڑھنا نہ سکھا سکی - یا للعجب

اس غلطی کو نباہنے کے لئے ٹھوکروں پر ٹھوکریں کھائیں اور جب تھیت ہو کر گر پڑے تو یہی کہتے بنی کہ "یہ ملک فتنہ و فساد سے بھرا ہوا ہے اب ایسی جگہ چلنا چاہیئے جہاں کے لوگ صادق القول ہوں اور ہم جہاد کا اجراء کر سکیں"۔ کُل کے کُل صادق القول اس دنیا میں تو ملنے سے رہے۔ انہیں بے اصولوں کی اصلاح انبیاء و علماء سے کروائی گئی ہے۔ البتہ ایسے صادق القول عالمِ بالا میں مل سکتے ہیں مگر مشکل یہ ہے کہ عالمِ آخرت میں ظاہری عبادت کی رسوم کا کوئی موقع نہیں، وہاں نہ نماز ہے نہ روزہ اور نہ جہاد۔

کہتے ہیں کہ صراطِ مستقیم سید صاحب کے افکار۔ الہام اور معتقدات کا آئینہ ہے۔ وہ مفہوم بتا دیتے تھے اور شاہ اسمٰعیل و عبدالحی اس کو اپنی اپنی عبارتوں میں منتقل کر دیتے تھے۔ یہ کتاب چار باب ایک مقدمہ اور ایک خاتمہ پر مشتمل ہے۔ مقدمہ خاتمہ اور باب اوّل و چہارم شاہ اسمٰعیل نے لکھا ہے جس میں ولایت اولیاء و انبیاء حُبِ ایمانی و حُبِ عشقی کی وضاحت کی ہے اور چوتھے باب میں سلوک راہِ نبوت کا بیان ہے اور اسی کو تمام اعمال و اشغال پر ترجیح دی گئی ہے۔ دُوسرا اور تیسرا باب مولوی عبدالحی کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے جس میں بدعات سے اجتناب۔ رذائل سے نجات اور طاعات و فضائل کے حصُول کا طریقہ بتایا گیا ہے اور تیسرے باب میں تھوڑے سے تصرف کے ساتھ چشتیہ، قادریہ نقشبندیہ و مجددیہ طریقوں سے جملہ اشغال و وظائف لکھے گئے ہیں

اصلاحی نقطۂ نظر سے دُوسرا باب کتاب کی جان ہے۔ یہ بدعتیں ملحدین ومُشرکین وصُوفیۂ خام اور علماء سوء کی وجہ سے زندگی میں شامل ہوگئی ہیں مثلاً شرع کی مخالفت ملحدانہ کلام کی عادت، شرک آمیز اعمال کی اشاعت، شہداء و رسُول کی شان میں بے ادبی وگستاخی، مسئلۂ تقدیر پر مباحثے، مرشد کی تعلیم میں مبالغہ، قبروں پہ سجدے، اور ان سے مُراد و حاجت طلبی، اولیا کی نذر و نیاز، عزاداری، تعزیہ سازی مُسرفانہ رسُومات شادی وغمی اور مخالفتِ نکاح بیوگان۔

یہ کچھ فطری بات ہے کہ نماز پڑھنے میں وسوسے اور پریشان خیال اکثر وبیشتر آجاتے ہیں۔ ان کے دفعیہ کے لئے شیخ یا رسُول کی یاد مجرب سمجھی گئی ہے، اس طرح شیطانی خطرات سے نجات مل جاتی ہے مگر صراطِ مستقیم میں لکھا گیا ہے کہ نماز میں رسولِ پاک کا خیال آجانا شرک ہے اور اس سے نماز فاسد ہوجاتی ہے۔ اس ہدایت میں نہ نال ہے نہ سُم۔ اس لئے اس کو صحیح نہیں سمجھا جاسکتا لیکن اگر وہ وسوسوں اور خطروں سے نہیں بچنا چاہتے تو وہ جانیں، اب اگر ایسا حکم دینا ہی تھا تو سوقیانہ زبان میں نہ دیا ہوتا۔ رسُول کی شان میں بے ادبی وگستاخی سے احتراز ضروری تھا۔ سید صاحب کے اخلاق وعقیدے سے قطعی بعید ہے کہ انہوں نے ایسی غلط بات ایسی بدتمیزی سے لکھی ہو یا لکھوائی ہو، یہ زبان صاحب روحانیت کی نہیں ہوسکتی۔ روحانیت والے تو ہرجا وبیجا مواقع پر رسُولِ پاک

کا اسم گرامی آتے ہی مجسّم تعظیم بن جایا کرتے ہیں، آگے چل کر بتایا گیا ہے کہ کاغذ پر کسی جاندار کی تصویر بنانا منع ہے، اسی طرح عالمِ خیال میں تصوّرِ شیخ بھی ناجائز اور شرک ہے ۔ وجہ شبہ اگر ایک سی ہوتی تو حکم بھی صحیح ہوتا۔ ظاہر ہے کہ شریعت میں خطرات پر محاسبہ نہیں کیا جاتا۔ تصوّر عالمِ خیال کی شے ہے۔ اس لئے اس پہ جرح نہیں کی جاسکتی۔ تصوّر تصویر سے علیحدہ ایک دوسرے جہاں کی چیز ہے لہٰذا محاسبہ سے بری ہے، اسے کبھی بھی شرک فی العلم کے تحت میں شمار نہیں کیا جاسکتا۔ سیّد صاحب، صاحبِ روحانیّت ہونے کی وجہ سے اس قسم کے مغالطے میں نہیں پڑ سکتے تھے ۔ یہ مغالطے پیدا کرنا فلسفی کا کام ہے ۔ اب الہام کو دیکھا جائے تو وحی سے بالکل جُدا ہے لوگ سفلی علوم اور عقلی گدّوں سے علمِ غیب کا دعویٰ کیا کرتے ہیں۔ سیّد صاحب کو ذہنی طور پر علمِ غیب حاصل تھا۔ وہ اپنے اسی علم کی مدد سے پیشینگوئیاں کیا کرتے تھے ۔ پھر خدا جانے عقیدت مندوں کو ان کے الہام کو وحی ثابت کرنے کا وہم کیونکر پیدا ہوا۔ وحی ثابت کرنے کے لئے جب ظاہری شکل نہ مل سکی تو انہوں نے باطنی وحی سے انہیں متصف کر دیا۔ لفظی اُکٹ پھیر سے دعویٰ یوں کیا کہ نبی کا درجہ مرحمت کر دیں۔ حالانکہ صریح طور پہ کہہ دیا گیا ہے کہ نبوّت ختم ہوچکی، اسی قسم کا مغالطہ پیدا کرکے انہوں نے امکانِ نظیر کی بحث شروع کی ۔ علماء اہلِ سنّت نے سر مغزنی کر کے . . . .

قرآن وحدیث . . . .

سے ان تمام ایجادات کی تردید کی مگر افسوس ہے کہ شرعی بحث کے علاوہ
انہوں نے تاریخی پہلو پر نظر نہیں کی اور واقعات سے نتائج نکال کر نہیں
دکھائے۔ بہرحال بغیر وحی باطنی کے بھی سید صاحب کی محض الہام کی بنا پر
عظمت تھی لیکن وحی باطنی کے اضافہ سے ان کی عظمت میں کوئی اضافہ
نہیں ہوا بلکہ تخفیف ہوئی، دعویٰ کیا گیا ہے کہ رسول علیہ الصلوٰۃ والتسلیم
سے کمالِ مشابہت رکھنے کی وجہ سے سید صاحب بے علم رہے اور
اُمّی کہلائے۔ اس سے حضور نبی کریم سے برابری کا دعویٰ نکلتا ہے،
جس کو کسی نوعیت سے سوائے گستاخی کے اور کچھ نہیں سمجھا جا سکتا ہے۔
پھر لکھا گیا ہے کہ ایسے مقام والوں کو احکام شرعیہ بے واسطہ پیغمبروں کے
وحی باطنی سے معلوم ہوتے ہیں ان لوگوں کو پیغمبروں کا شاگرد بھی کہہ سکتے ہیں
اور پیغمبروں کا اُستاد بھائی بھی۔ اور ان کا علم بعینہٖ پیغمبروں کا علم ہے۔
مگر یہ علم ظاہر کی وحی یعنی جبرئیل علیہ السلام کے واسطے سے اُنہیں ملا کرتا
ہے اور ایسے لوگوں کو پیغمبروں کی سی عصمت بھی ملتی ہے (گویا اس طرح
غیر نبی کو معصوم بنا دیا) مزید تشریح کی گئی ہے کہ اس مقام والوں کو مکالمہ
و مسامرہ کا خلعت ملتا ہے یعنی اللہ تعالیٰ سے باتیں ہاتھ پکڑ کر کرتے
ہیں اور گاہے کلام حقیقی می شود۔ چنانچہ سید صاحب کے متعلق صاف
صاف لکھا گیا ہے کہ خدا سے براہ راست یوں پوچھا اور اُس طرف سے
ایسا ایسا حکم ملا۔ ناطقہ سر بہ گریباں ہے اسے کیا کہیئے۔ سید صاحب
کے مدارج علیہ کا اظہار اس طرح کیا ہے کہ جناب رسالتماب صلی اللہ

علیہ وسلم نے خواب میں تین خرمے اپنے دستِ مبارک سے کھلائے۔ بیدار ہو کر اثرہ و ذائقہ کو انہوں نے محسوس کیا۔ خواب میں جناب ولایت مآب حضرت علی مرتضےٰ کرم اللہ وجہہٗ نے غسل کرایا اور بی بی فاطمۃ الزہرا رضی اللہ تعالےٰ عنہا نے اپنے ہاتھ سے لباس فاخرہ پہنایا۔ اس طرح کمالات طریق نبوت حاصل ہو گئے۔ خدا تعالےٰ نے سید صاحب کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور انوارِ قدسیہ دکھا کر انعام و اکرام مرحمت فرمائے۔ لہٰذا مجاہدات و مراقبات کرنے سے پہلے یہ تمام مراتب بذریعہ علم لدنی حاصل ہو گئے۔ نسبت قادریہ و نقشبندیہ اس طرح ملی کہ جناب غوث الثقلین اور جناب خواجہ بہاء الدین نقشبند میں ایک مہینہ تک نزاع رہا۔ بالآخر یہ طے ہوا کہ دونوں بہ یک وقت اپنے برکات عطا کر دیں۔ خواجہ بختیار کاکی اوشیؒ کے مزار پاک پر مراقبہ کر رہے تھے۔ اسی عالم میں خواجہ بختیارؒ سے ملاقات ہوئی اور انہوں نے نسبت چشتیہ اسی وقت القا کر دی۔ حیرت ہے کہ جہاد کو جاتے ہوئے جب اجمیر شریف سے گذرے تو نہ حضرت خواجہ غریب نوازؒ کے مزار پر گئے اور نہ اس طرف سے کوئی روحانی اشارہ ہوا۔ پہلی نظر بتاتی ہے کہ صراط مستقیم میں افراط کی بہتات ہے جس سے غیر ممکن اور ممنوع بھی جائز ہو گئے ہیں۔ اس تعلیم میں بجائے روحانیت کے منطقی قیل و قال زیادہ ہے۔ صراط مستقیم کے بعض مضامین تقویۃ الایمان کے مضامین سے مختلف ہیں۔ اس اختلاف سے شاہ اسمٰعیل کے غلط معتقدات کی اصلاح ہو جانا چاہیئے تھی مگر شاہ اسمٰعیل اپنی روش پر قائم رہے اور

کرامت یہ ہے کہ معتقدینِ سیّد صاحب کے خیالات کو نظر انداز کرکے منسوخ شدہ تقویۃ الایمان پر ہی ایمان رکھتے ہیں۔ جس کے متعلق شاہ اسمٰعیل نے خود فرمایا تھا کہ اس میں شرک خفی کو شرک جلی لکھ دیا ہے لہٰذا لوگ اعتراض کریں گے اور جیسا کہ تقویۃ الایمان میں درج ہے، انکارِ شفاعت انکار سفر زیارتِ قبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، انکارِ مذہب اربعہ انکارِ غیب دانی رسولؐ، انکارِ کرامت اولیاء۔ انکارِ جشن میلاد شریف، انکارِ صوفیہ کرام، انکارِ ایصال ثواب، انکارِ استمداد و استعانت اولیا و انبیاء اُن کا وطیرہ بن گیا ہے۔ اس تعلیم کو قبولیت عام کی شہرت دی گئی ہے لیکن اس تعلیم کی جو مخالفت کی گئی ہے اس کے متعلق ہوا بھی نہیں دیتے حالانکہ شاہ عبدالعزیزؒ کے خاندان والے اور دیگر علماء اہل سنت آستینیں چڑھا کر سامنے آئے تھے اور ان کے دقیق مباحثوں کے حالات اب تک کتابوں میں محفوظ ہیں مگر آئے دن آج بھی وہی بحث جاری ہے جس طرح اپنے ایجاد کردہ ولایتِ ولی اور ولایت نبی کے فرق کی تصدیق سیّد صاحب کی بیعت کے وقت شاہ عبدالعزیزؒ کی زبان سے کرائی ہے اسی طرح اپنی طریقت و فقر کی ترمیموں کا ثبوت شاہ عبدالعزیزؒ کے ایک خواب سے بہم پہنچایا ہے۔ لکھتے ہیں کہ شاہ صاحب کو خواب میں اس سال جبکہ سیّد صاحب حجاز کو گئے ہیں۔ سیّدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کی ۱۲ رجب المرجب کو زیارت کی سعادت حاصل ہوئی تھی۔ شاہ صاحب نے کچھ سوال پوچھے ہیں تو ان کے یہ جوابات ملے۔ چاروں فقہا کے مذہب میں کوئی

بھی مذہب مجھ کو پسند نہیں۔ سب میں افراط و تفریط ہوگئی ہے۔

۲۔ طریق اولیاء میں کوئی طریقہ میرے طور پر نہیں ہے۔ ہمارے عہد میں تقرب الٰہی کے لئے صرف تین شغل تھے۔ ذکر، تلاوتِ قرآن اور نماز۔ میں اب لوگوں نے محض ذکر کو شغل خاص مقرر کر لیا ہے اور ہر طریقے میں ایجادیں کر لی گئی ہیں، اس لئے وہ سب اصل سے دور جا پڑے ہیں۔

۳۔ درخواست قبول کر کے اور ان اصولوں کی تلقین کر کے شاہ صاحب کو بیعت سے سرفراز فرمایا۔

۴۔ فرمایا میرے اور دیگر صحابہؓ کی باہمی شکایتیں برادرانہ تھیں مگر نافہم لوگوں نے انہیں بڑھا لیا ہے اور یہ لوگ میری اولاد میں نہیں ہیں۔ یعنی اہلِ تشیّع۔

۵۔ اس کے بعد شاہ صاحب سے دریافت کیا کہ کسی افغانی نے پشتو میں ایک کتاب میری مذمّت میں لکھی ہے۔ وہ تم نے دیکھی ہے؟ عرض کیا کہ مجھے علم نہیں اور نہ میں پشتو جانتا ہوں۔

شاہ صاحب کے اس خواب کی نقلیں جا بجا ارسال کر کے شائع کی گئی تھیں، تاکہ خلائق راہِ اعتدال اختیار کرے اور افراط و تفریط سے باز آئے۔ (سوانح احمدی) اس خواب سے اُن مضامین

کی تصدیق مقصود ہے جو پہلے تقویۃ الایمان اور صراط مستقیم میں شائع کئے جا چکے تھے۔ یہ خواب "امالی عزیزیہ" میں بھی موجود ہے۔ معلوم نہیں یہ کتاب کس درجہ قابلِ سند ہے لیکن شاہ عبدالعزیزؒ نے اس خواب سے کوئی سبق حاصل نہیں کیا۔ وہ اپنے عقائد ہی پر قائم رہے۔ ایسے کلمات حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی ذاتِ گرامی کی شان کے شایان نہیں۔ وہ خواب میں بھی زیادتی ذکر کے خلاف نہیں کہہ سکتے تھے۔ نماز اور تلاوت قرآن تو خود منجملۂ ذکر ہیں ہر دم کے ذکر اور ہبتاتِ ذکر کی تاکید سے قرآن پاک بھرا ہوا ہے قرآن پڑھنے والے ذکر کی اہمیت سے واقف ہیں کہ اُٹھتے بیٹھتے اور سوتے جاگتے ذکر کرنے کا حکم ہے۔ شاید ان حضرات نے ذکر کے سلسلہ میں سورۂ زخرف کی آیت نمبر ۳۶ پر دھیان نہیں دیا جس میں فرمایا ہے جو کوئی شب کوری کرے ذِکرِ رحمٰن سے، مقرر کرتے ہیں واسطے اس کے ایک شیطان۔ پس وہ اس کا ہم نشین ہو جاتا ہے۔ امداد المشتاق کے صفحہ ۶۸ پر نمبر ۹۸ میں ارشاد حاجی امداد اللہ صاحبؒ ہے:-

"بعضے کثرت ذکر سے انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہر دم ذکر کرنا بدعت ہے اور بے اصل، میں کہتا ہوں آیاتِ کثیرہ سے دوام ذکر ثابت ہے:۔ یذکرون اللہ قیاماً وقعوداً وعلیٰ جنوبہم ویتفکرون فی خلق السموات والارض ۔ الآیہ ۔ پس احوال انسان اس ایک

حالت سے خالی نہیں ہے۔ اب وہ کون حالت ہے کہ جس میں ذکر نہ ہوگا۔ اور فرمایا ہے۔ فاذکرونی اذکرکم۔ وہ کون آدمی ہے جو یہ چاہتا ہے کہ اس کو خدا یاد نہ کرے اور فرماتا ہے:۔

قل اللہ ثم ذرھم فی خوضھم یلعبون۔ اس سے ثابت ہے کہ ہر دم اللہ اللہ کرنا چاہیئے۔

اس سے بھی زیادہ واضح تشریح سورۂ مزمل کی آیت نمبر ۸ میں کی گئی ہے جس کا مفہوم ہے کہ ذکر الٰہی میں علائق کو ترک کرکے محو و فنا ہو جاؤ۔ اس کے علاوہ سورۂ مدثر کی آیت نمبر ۵۴ میں تکرار کی گئی ہے کہ قرآن پاک خود ایک ذکر ہے۔ اب ان علانیہ اللہ کے فرمانوں کے مقابلے میں خواب شب میں جو حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے کلمات منسوب کئے ہیں ان کو کیسے تسلیم کر لیا جائے اور طرفہ تماشا یہ ہے کہ یہی خواب شاہ عبدالعزیزؒ کے ملفوظات میں موجود ہے مگر اس میں مد نمبر 5 کے علاوہ بقیہ ہدایات کا نام تک نہیں ہے اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ افترا پردازوں کا کیا حشر ہوگا۔

مختصر یہ کہ جو تعلیم ان کے یہاں رائج ہے وہ شاہ اسمٰعیل کی ساختہ پرداختہ ہے۔ سید صاحب کو اس سے کوئی تعلق نہیں اور نہ وہ ان کی روحانیت کے مطابق ہے۔ یار لوگوں نے زیب داستان کے لئے ان سے نامزد کر دی ہے جو تعلیم ان کے یہاں رائج ہے وہ "لا" سے آگے نہیں بڑھی اور الا اللہ تک نہیں پہنچی، اس

میں ہر بات کی نفی ہی نفی ہے ، کوئی چیز شرک سے نہیں بچی ہے ۔ سکھوں کے مورخ نے بالکل بجا لکھا ہے کہ ان دیوانوں میں بگاڑنے کی قابلیّت تھی ، بنانے کی اہلیت نہیں تھی ۔ یہی صورت حال آج بھی ہے ۔ یہ اپنے اندرونی اختلافات کا بھی علاج نہیں کر سکتے ، ان میں مختلف فرقے اور مذاہب پیدا ہو گئے ہیں ۔ مولوی عبید اللہ سندھی ان سب کے اختلافات کو تسلیم کرتے ہیں مگر ولی اللہی تحریک کی تشریح سیاسی نقطۂ نظر سے کرتے ہوئے ان اختلافات کو نظر انداز کر دیتے ہیں ۔ یہ لوگ توحید کے مبلّغ ہیں ۔ لہٰذا تنزیہہ میں اس قدر محو ہوئے کہ نظام الٰہی اور انبیا و اولیا کی بھی تنقیص کر دی ۔ دعویٰ یہ ہے کہ حُبِّ ایمانی اور حُبِّ عشقی میں کمال رکھتے ہیں اور یہ بھی اقرار ہے کہ یہ مراتب بغیر محبّت کی چاشنی کے حاصل نہیں ہو سکتے ۔ لیکن ان کے یہاں آہ سوزاں کا پتہ نہیں ۔ دردِ دل سے بے خبر ہیں ، چوں و چرا کے عادی ہیں ، شدّت و شقاوت نے زاہدِ خشک بنا دیا ہے ۔ ان کے روکھے پن سے توحید جامد و محدود ہو کر رہ گئی ہے ۔ یہ صاحبان اگر میری سُن لیں تو نہایت ادب سے عرض کر سکتا ہوں ۔ ؎

ہائے دل کیا چیز تھا تم نے اسے کیا کر دیا

کتابیات

۱۔ سوانح احمدی ——— مولوی محمد جعفر تھانیسری

۲۔ حیاتِ طیبہ ——— مرزا حیرت دہلوی

۳۔ سیرت سید احمد شہید ——— مولانا ابوالحسن علی ندوی

۴۔ سید احمد شہید ——— مولانا غلام رسول مہر

۵۔ برکات اسلام ——— مولوی محمد جعفر تھانیسری

۶۔ سیف الجبار ——— مولانا فضل رسول بدایونی

۷۔ باغی ہندوستان ——— مولانا عبدالشاہد خاں شروانی

۸۔ صراطِ مستقیم ——— سیّد احمد شہید رائے بریلوی

۹۔ تقویۃ الایمان ——— شاہ اسمٰعیل شہید دہلوی

۱۰۔ تحفہ محمدیہ ——— سیّد اشرف علی گلشن آبادی

۱۱۔ الاستمداد علی اجیال الارتداد

۱۲۔ ملفوظات شاہ عبدالعزیز

۱۳۔ موج کوثر ——— شیخ محمد اکرام آئی سی۔ ایس

۱۴۔ سوانح قاسمی ——— مولانا مناظر احسن گیلانی

۱۵۔ روضات — — — شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ

۱۶۔ تذکرہ رشیدی

۱۷۔ شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک — مولانا عبیداللہ سندھی

۱۸۔ الیاقوتۃ الواسطہ ——— مولانا محمد احمد رضا خاں بریلویؒ

تعلیمی پریس بیرون اکبری گیٹ لاہور